صحائفِ اسعد

جامع

تسکین

ناشر: ملک اینڈ کو پبلشرز
اُردو بازار دہلی

تعارف

تسکین، تخلص۔ محمد یٰسین نام، قصبہ سُورُوں (ضلع ایٹہ) آبائی وطن ہے۔
سال تولید آخر ۱۸۹۸ء یا شروع ۱۸۹۹ء۔ صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں۔
فارسی تعلیم مروجہ درسیات تک محدود رہی، انگریزی تعلیم انٹرمیڈیٹ (ایف اے) تک ہے۔

۱۹۲۲ء میں بہ حیثیت سب انسپکٹر محکمہ پولس میں تقرر ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں پبلک پراسیکوٹر (کورٹ انسپکٹر) کے عہدے سے پنشن لے کر میرٹھ میں سکونت اختیار کی۔

شاعری مجھے ورثے میں نہیں ملی، میرے خاندان میں کوئی شاعر نہیں ہوا البتہ میرے پھوپی زاد بھائی مولوی محمد محفوظ اللہ صاحب محفوظ فاروقی مرحوم و مغفور اپنے دور کے ممتاز شاعروں میں تھے، مرحوم کا نعتیہ کلام آج بھی اہلِ عقیدت آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

مجھے بچپن سے شاعری کا ذوق تھا۔ ۱۹۲۰ء میں حضرت عزیزؔ لکھنوی مرحوم

سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ اس چالیس سالہ شاعرانہ زندگی کی یادگار میرے کلام کے تین مجموعے۔ سرمایہ تسکین جلد اوّل و دوم اور گلگونہ شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا اور آخری مجموعہ "متاعِ تسکین" زیرِ ترتیب ہے۔

میری شاعری کی ابتدا نظم گوئی سے ہوئی اس زمانے کا رنگِ تغزّل مجھے ناپسند تھا اس لئے نظم نگاری سے زیادہ شغف رہا۔ پھر کچھ ایسے حالات وارد ہوئے کہ طبیعت کو غزل سے زیادہ لگاؤ ہو گیا اور نظم نگاری ترک ہو گئی۔

بہر حال گذشتہ ۴۰ سالہ دور میں اکثر مشاہیرِ شعر و ادب سے سلسلہ مکاتبت جاری رہا۔ اُن میں سے بہت سے حضرات وفات پا چکے ہیں، مجھے دلی افسوس ہے کہ اُن کے خطوط محفوظ نہیں رہے۔

اس مجموعۂ مکاتیب میں صرف تین حضرات کے خطوط شامل ہیں جو محض بطور یادگار ابتک رکھے ہوئے تھے۔ مجھے اس ذخیرۂ خطوط کی ترتیب و تدوین کا خیال سب سے پہلے میری عزیزہ مریمؔ ادا[1] فاروقی سلمہا نے دلایا، جو اُردو شعر و ادب کا بہت صحیح ذوق رکھتی ہیں اور خوش فکر شاعرہ بھی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ مسلسل تحریک و اصرار نہ کرتیں تو غالباً خطوط کا یہ ذخیرہ بھی تلف ہو جاتا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزہ سلمہا کو ہمیشہ شاد کام رکھے آمین۔

تسکینؔ

---

[1] مریمؔ ادا؛ حضرت محفوظ مرحوم (جن کا ذکر سطورِ بالا میں آچکا ہے) کی بہو، یعنی اُن کے فرزند مولوی محمد معصوم اللہ ہوشؔ فاروقی سلمہٗ کی اہلیہ ہیں۔

صحائفِ اسعد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجموعہ خطوط کے اس حصہ میں مخدومی و محترمی جناب الحاج مولانا اسعد اللہ صاحب قبلہ مدظلہ، کے مکاتیب عالیہ نقل کیے جاتے ہیں ۔۔ جناب مولانا آج کل سہارنپور کے مشہور و قدیم جامعہ مظاہر علوم کے ناظم ہیں، موصوف کی زندگی اس درسگاہ کی چاردیواری کے اندر درس و تدریس اور گوشہ نشینی میں گذری ہے ۔ میں جناب مولانا کا دیرینہ عقیدت گزار اور نیاز مند ہوں، اس لئے موصوف کے تبحر علمی اور مکارم اخلاق کو تفصیلاً قلم بند کرنا "چھوٹا منہ بڑی بات" ہونے کے علاوہ یوں بھی غیر ضروری ہے کہ ان مکاتیب کا مقصد ترتیب، مناقب نگاری نہیں۔ مگر مصداق "مشک آنست کہ خود بگوید نہ آنکہ عطار بگوید" جہاں جناب مولانا کے کمالات علمیہ اور فضائل اخلاق کے گہرے نقوش ان خطوط میں نمایاں

ہیں وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف ایک بلند پایہ ادیب و شاعر ہیں۔ اگرچہ آپ ۲۰، ۲۵ سال سے فکر سخن ترک فرما چکے ہیں، لیکن شعر و ادب کے متعلق موصوف کی پاکیزگی ذوق، بلندی معیار، نکتہ گوئی و نکتہ سنجی اور ادبی لطائف و ظرائف کے نادر و دل کش نمونے ان مکتوبات میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

آج کل عام خیال ہے کہ قدیم عربی و دینی مدارس کے ماحول میں ذوق شعری کی گنجائش بہت ہی کم ہے، درجۂ عموم تک تو میں بھی اس رائے سے متفق ہوں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس "خشک" اور "مولویانہ" ماحول میں "سخن داں و سخن شناس" حضرات کی کمی نہیں، لیکن یہ حضرات شعر و سخن سے اس لئے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے کہ اس فن کو علوم دینیہ کے مقابلہ میں ناقابلِ اعتناء سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعری و ادبی دنیا ایسے حضرات سے غیر متعارف ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں اصل خطوط کے متعلق چند نہایت ضروری معروضات پیش کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ان خطوط کی حیثیت خالصتاً "نجی" یا "پرائیویٹ" ہے، دراصل جناب مولانا نے مجھے اپنے حسن ظن کی بنا پر "مخاطبِ صحیح" تصور فرما کر یہ خطوط میری قدر افزائی یا بقول خود میری "انبساط خاطر" کے لئے تحریر فرمائے ہیں، یعنی مقصدِ نگارش ہرگز ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کو طبع کرا کے منظر عام پر لایا جائے۔ البتہ دوران مکاتبت خود مجھے محسوس ہوا کہ اگر یہ مکاتیب شائع کر دیے جائیں تو اربابِ شعر و ادب ان کو

ضرور آنکھوں سے لگائیں گے، چنانچہ میں نے جناب مولانا کی خدمت میں حصول اجازت کے لیئے بار بار درخواست کی، مگر میری استدعا ہر مرتبہ رد کردی گئی، بلکہ میرے پیہم اصرار پر کچھ اظہار ناپسندیدگی بھی فرمایا گیا۔

(۲) بہرکیف ان خطوط کی نجی یا پرائیویٹ حیثیت متعین ہونے کے بعد یہ حقیقت بھی خودبخود واضح ہوجاتی ہے کہ ان کو تحریر کرنے میں "اظہار ہمہ دانی" یا علمی و ادبی" تصنع یا تکلف" (جو بالعموم اشاعتِ عام کے خیال کی تہ میں کار فرما ہوتا ہے) مطلقاً دخل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ خطوط بالکل بے تکلفانہ انداز میں لکھے گئے ہیں گویا حسبِ ارشاد جناب مولانا ع

لکھ دیا خط میں اُنھیں وقت پہ جو یاد آیا

(۳) ان مکاتیب کی مجموعی تعداد ۵۷ ہے، ان میں سے ۴، ۵ خطوط کو چھوڑ کر جن کے لئے "لفافہ" استعمال ہوا ہے بقیہ تمام مکاتیب "پوسٹ کارڈوں" پر تحریر کیے گئے ہیں، یہ سلسلہ مراسلت ۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء سے شروع ہوکر ۹ مارچ ۱۹۴۹ء کو ختم ہوا، ان میں سے شاید تین یا چار خط تو خود جناب مولانا نے اپنے دستِ مبارک سے لکھے ہیں (چونکہ موصوف کو ایک زمانے سے ضعف بصر کی شکایت ہے) بقیہ تمام خطوط مولوی انعام الرحمٰن صاحب کے قلم سے تحریر کردہ ہیں۔ جو مولانا کے شاگرد رشید اور نہایت خوشنویس ہیں

(۴) میں نے ان مکاتیب کی ترتیب میں بکثرت "تصرف" سے کام لیا ہے۔ لیکن میرا یہ تصرف محض "حذف و اختصار" تک محدود ہے، میں نے ترمیم و اضافہ کو اخلاقی و ادبی جرم سمجھا ہاں یہ لحاظ ضرور رکھا کہ میرے تصرف سے

مضمون بے ربط نہ ہونے پائے، چونکہ ان مکاتیب میں اکثر مضامین کا سلسلہ کئی کئی پوسٹ کارڈوں پر پھیلا ہوا تھا، اس لیے میں نے ایسے تمام خطوط کو اکثر و بیشتر یک جا طور پر نقل کر دیا ہے، جیسا کہ مندرجہ تاریخوں سے واضح ہوگا۔ بہر حال اس وجہ سے ان خطوط کی تعداد ۷۵ سے گھٹ کر صرف ۲۸ رہ گئی ہے۔

(۵) جناب مولانا مجھ حقیر پر اس قدر شفقت و اکرام فرماتے ہیں کہ تحریراً و تقریراً میری نیاز مندانہ حیثیت کو یکسر نظر انداز کر جاتے ہیں، میں نے کئی بار صدائے احتجاج بلند کی مگر مسموع نہ ہوئی، بلکہ اس کا جواب کچھ اس لاجواب انداز میں دیا گیا کہ میرے لیے بالآخر صبر و شکر کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ (ملاحظہ ہو مکتوب ۱۲) مختصر یہ ہے کہ جناب مولانا کی وسعت اخلاق کا یہ پہلو ان خطوط میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ خصوصاً "القاب و آداب" تحریر فرمانے میں موصوف نے بہت ہی وسعت و تنوع سے کام لیا ہے اور میری قدر افزائی کے لئے قریب قریب ہر خط میں جداگانہ طرز تخاطب اختیار کیا ہے۔[1] میں نے یہ تمام القاب و آداب حذف کر دیے ہیں اور ہر امکانی کوشش کی ہے کہ میری ذاتی و صفاتی حیثیت پس پردہ رہے اور میرا ذکر کہیں بھی نہ آنے پائے لیکن بعض بعض مقامات پر مطالب خبط اور مضمون بے ربط ہو رہا تھا، اس لئے

---

[1] چند منظوم القاب بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں:۔

صاحب علم و فضل و ذوق سلیم	مستحقِ کرامت و تکریم (یا)
ناظم رنگیں خیال و ناثر شیریں مقال	مولوی نسکیں صاحب، مرجع اہل کمال

مجھے اپنے متعلق مولانائے محترم کی "داد و تحسین" دل پر جبر کر کے نقل کرنا ہی پڑی،
میرے لئے یہ بہت ہی دشوار گزار منزل تھی، جس کا صحیح اندازہ اصل مکاتیب
کو پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ممکن ہے کہ اس ضمن میں مجھ سے کچھ فروگذاشت
بھی ہو گئی ہو، یعنی بایں ہمہ مجھ پر "مدحت پسندی" کا الزام عائد ہوتا ہو، تو بجز
اس کے اور کیا لکھ سکتا ہوں کہ مجھے اپنے جرم کا اعتراف ہے۔

(۶) ان مکاتیب میں دو خطوں کے متعلق خصوصیت کے ساتھ اظہارِ خیال
ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلا مکتوب ۱۹ ہے، جس میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور
کے بارے میں بہت مفصل معلومات درج ہیں۔ موجودہ ترقی پسند اور تجدد نوا
زمانے میں، جبکہ تعلیم و تدریس کے متعلق نئے نئے طریقے اور اسلوب ایجاد و
اختیار کیے جا رہے ہیں، ایک ایسی قدامت پسند اور قدیم درس گاہ کے تعلیمی
نظام اور حُسن انتظام کا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں جو اپنے زمانۂ قیام سے
آج تک حکومت وقت کی سرپرستی یا مالی فیاضیوں سے یکسر بے نیاز رہی ہے
اس خط کا ایک اور پہلو بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور
اور سبق آموز ہے۔ موجودہ دور میں ہزاروں سرکاری اور غیر سرکاری اسکول
اور کالج ہیں، لیکن ان میں سے کسی ایسے مدرس، یا ٹیچر، یا لکچرار، یا پروفیسر
کو بطور مثال شاید ہی پیش کیا جا سکتا ہو جو قلیل المعاش ہونے کے علاوہ
کثیر العیال بھی ہو، اور بایں ہمہ اپنی تنخواہ میں اضافہ کیے جانے کی پیش کش کو
ٹھکرا دے محض اس بنا پر کہ فرائض متعلقہ اور کار مفوضہ کے لحاظ سے اس کا
موجودہ مشاہرہ کافی ہے اور وہ کسی ترقی یا اضافہ کا مستحق نہیں۔

ایثار و اتقا کی یہ مثالیں اگر کہیں ملتی ہیں تو انھیں قدامت پسند درسگاہوں میں۔ جناب مولانا کی ذات گرامی ان مثالوں میں ایک روشن مثال ہے۔

یہ میرا دوسرا مکتوب ۲۵ ہے جو موجودہ زمانے میں بہت سے امتحان لینے والوں اور امتحانات کے پرچے جانچنے والوں کے لئے اپنے اندر بہت کچھ درس بصیرت رکھتا ہے۔

(۷) ان خطوط میں میرے محبوب و مخلص دوست الحاج حضرت جگر صاحب مرادآبادی کا ذکر خیر بھی بار بار آیا ہے۔ موصوف بھی جناب مولانا سے ارادت دلی رکھتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ سلسلۂ مکاتیب شروع ہوا تھا، میرا قیام لکھنؤ میں تھا۔ جگر صاحب اکثر لکھنؤ آتے اور میرے یہاں قیام فرماتے تھے۔ اس لئے تقریباً تمام خطوط موصوف کی نظر سے گزرے ہیں اور انھوں نے بھی ان کو پڑھ کر لطف اُٹھایا ہے، بلکہ کبھی کبھی کسی شعر یا ادبی استفسار پر اظہار خیال بھی فرمایا ہے۔ اور میرے توسط سے مولانائے محترم کی خدمت میں اکثر سلام و پیام بھی پیش کیا ہے۔

یہ خطوط میں نے مرتب تو کر لئے ہیں، لیکن ابھی جناب مولانا کی اجازت حاصل کرنا باقی ہے، اور یہ معمولی کام نہیں۔ بہرحال سردست میرے لئے یہی مسرت کیا کم ہے کہ جناب مولانا کی (اور ایک لحاظ سے خود میری بھی) ایک قلمی و تحریری یادگار رتیار ہوگئی۔

(تسکینؔ)

میرٹھ، ۷ ار جولائی ۱۹۵۹ء

مطابق ۱۰ ار محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

(روز جمعہ)

(۱)

۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء

.... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک مرتبہ شیخ ابوالفضل نے اپنے والد ملّا مبارک کو ایک خط میں لکھا تھا ؎

سلامے چو اخلاق تو مشکبو سلامے چو الفاظ تو دُر فشاں

میں اس کے ساتھ ساتھ اپنے مخلص محترم کو یہ بھی لکھتا ہوں ؎

سلامے چو نام تو تسکین دل سلامے چو ذکر تو آرام جاں

حسب وعدہ مفصل عریضہ لکھنے والا تھا کہ ایک اندوہ ناک سانحہ پیش آگیا، میرے ایک دوست مشرقی پنجاب کے خونین ہنگامے میں مع اپنے برادر کے شہید کر دیئے گئے۔ میں ان کی آگاہی حال کے لئے مدّت سے منتظر تھا، حتیٰ کہ اخبارات اور ریڈیو پر بھی ان کے متعلق اعلانات شائع کئے گئے، تین چار یوم ہوئے یہ دل ہلا دینے والی خبر سنی، دماغ اس حادثے سے بیحد متاثر ہے۔

اس لئے یہ مختصر عریضہ ارسال کر رہا ہوں کہ جناب کو زحمتِ انتظار نہ ہو۔ مجھے جس قدر جناب سے ملاقات کا اشتیاق ہے وہ منّت کش اظہار نہیں۔

حسبِ موقع خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب کا ایک شعر سُنئے، خوب کہا ہے ؎

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

آج کل ہمارے طلبہ آپ کے اس شعر کو بہت زیادہ "دادِ تحسین" کے ساتھ پڑھتے ہیں ؎

گدا کو بھی اہلِ کرم کم نہ سمجھیں   بہت کچھ دیا جس نے دل سے دعا دی

جگر صاحب کی خدمت میں اخلاص میں ڈوبا ہوا سلام مسنون اور ان کی بے لوث غائبانہ ہمدردیوں کا دلی شکریہ، ابو الفضل کے ایک شعر سے مضمون عریضہ کا آغاز کیا تھا اور فیضی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

اے سفر کردہ کہ در خاطرِ ما میگذری
ہیچ دانی کہ کجائی و کجا میگذری

(محمد اسعد اللہ)

(۲)

۴؍ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ہجری[1]

...... صحیفۂ گرامی گوناگوں عزتوں اور نو بنو کیف آفریں مسرتوں کو آغوش میں لے کر شرف صدور لایا ہے

جماک اللہ عن شر النوائب جزاک اللہ فی الدارین خیرا[2]

میں نے ہر چند چاہا کہ ایک مفصل عریضہ خدمت سامی میں پیش کرنے کی عزت حاصل کروں۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ قال علی کرم اللہ وجہہ۔ عرفت ربی بفسخ العزائم[3]

اب بمصداق مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ[4] یہ ارادہ کیا کہ تفصیل کو چھوڑ کر اجمال ہی پر اکتفا کروں اور اجمال کو بھی مختلف اقساط میں پیش کروں، امید ہے کہ جناب

---

[1] ۲۵؍ اپریل ۱۹۴۸ء (مطابق مہر ڈاک خانہ) [2] اللہ آپ کو مصائب کے شر سے محفوظ رکھے اور دارین میں بہتر جزا عطا فرمائے۔ [3] حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹ جانے سے پہچانا۔ [4] جو چیز پوری حاصل نہ کی جا سکے اس کو بالکل چھوڑا بھی نہ جائے۔

میرے مشاغل و امراض کے پیشِ نظر اس کوتاہی کا خیال نہ فرمائیں گے۔

علی بن مکرم تمیمی نے ایک ادیب و شاعر کی معرفت عربی کے مشہور شاعر ابو الطیب احمد بن حسین متنبی کے پاس کچھ ہدایا و عطایا بھیجے تھے متنبی نے شکریہ کے طور پر مشہور مدحیہ قصیدہ [1]

ضروب الناس عشاق ضروبا　　فاعذرہم اشفہم حبیبا

علی بن مکرم کے پاس ارسال کیا۔ اس قصیدہ کا ایک نفیس اور عمدہ شعر یہ بھی ہے [2]

وما ریح الریاض لہا ولکن　　کساہا دفنہم فی الترب طیبا

گویا مرزا غالب کا مشہور مطلع ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اسی سے ماخوذ ہے۔

متنبی اس قصیدے کے آخر میں ایک شاعرانہ تعلی کے بعد کہتا ہے [3]

ولعیت بمنلو منک الہدایا　　ولکن زدتنی فیہا ادیبا

---

[1] مختلف لوگ مختلف معشوقوں پر عاشق ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ معذور وہ شخص ہے جس کا معشوق سب سے بہتر ہو۔

[2] باغوں کی خوشبو ان کی اپنی ذاتی نہیں ہے لیکن تیرے بلند کردار اور آباد اجداد کے دفن ہونے نے ان کو خوشبو کا لباس پہنا دیا ہے۔

[3] میں تیرے ہدایا کا منکر نہیں ہوں لیکن اس مرتبہ تو نے ان میں ایک ادیب کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔

جب قاصد نے یہ سُنا تو بیساختہ کہہ اٹھا جَعَلَنِیْ وَاللّٰہِ اَدِیْبًا ۵ جناب نے
بھی بعینہٖ اسی طرح باوجود میری ہیچ مدانی ہیچ میرزی کے مجھکو ادیب بنا دیا اور
حسن ظن کی ایک بے مثال مثال قائم کردی۔

محمد اسعد اللہ

لہ بخدا (متنبی نے) مجھے ادیب بنا دیا۔

(۳)

۱۶ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ہجری[۵]

...... سلامے ہمچو آب زندگانی		سلامے خوشتر از عہد جوانی
سلامے چوں نوید شادمانی		سلامے چوں امید کامرانی

عافیت خواہ مزاج سامی کو بحمدہ تعالیٰ اب وہ عافیت حاصل ہے جو اس خاص زمانے اور مخصوص ماحول میں حاصل ہو سکتی ہے، میں علاوہ ایک پراگندہ حال قوم کے فرد ہونے کے بجائے خود مستقل طور پر منتشر الخیال، پراگندہ دل اور پریشان روزگار انسان ہوں، اس لئے لازمی طور پر میرے عریضہ کے اجزاء، باہم مرتبط نہ ہونے چاہئیں۔ امید ہے کہ میری اس کمزوری پر نظر نہیں فرمائی جائے گی۔ معمولی مناسبت سے مرزا غالبؔ کا یہ شعر یاد آگیا۔

وہ مری چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا		راز مکتوب بہ بے ربطیٔ عنواں سمجھا

عنواں کے لفظ سے حسرتؔ صاحب کا مطلع بھی زبانِ قلم پہ آگیا ــ

---

۵ ــ ۲۷ اپریل ۴۸ ۱۹ء (مطابق مہر ڈاک خانہ)

شکوۂ جور جو ہم سے کسی عنواں نہ ہوا　　　حشر میں بھی وہ جفا کار پشیماں نہ ہوا

دل تو مجھے پہلے ہی سے بہکنے کی عادت ہے اور اس عریضے میں خصوصیتِ مخاطب کی وجہ سے زیادہ بہک رہا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس زمانۂ قحط الرجال میں مخاطب صحیح کا ملنا عنقائے مغرب سے کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجھے کوئی مخاطب صحیح مل جاتا ہے تو میں اس کو عموماً زبان و قلم سے کافی پریشان کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہوں۔

مجھے جناب کے علمی ذوق سے بجا طور پر قوی امید ہے کہ لکھنؤ کے قیام سے علوم عربیہ کی تحصیل میں بیش از بیش فائدہ اٹھا رہے ہوں گے، اب تو غالباً مشافہتہً تعلیم و تعلّم کا سلسلہ جاری ہو گا، آج کل کونسی کتابیں زیر مطالعہ ہیں؟ میری دلی خواہش ہے کہ میں اس سلسلہ میں جناب کی علمی ترقیات سے جلد مطلع ہوں۔ جگر صاحب کی خدمت میں سلام نیاز و پیام شوق۔

محمد اسعد اللہ

(۴)

۱۸ رجمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ہجری [1]

.... آں محترم نے اپنے ۱۵ اپریل سنہ رواں کے ملفوف گرامی میں احقر کے طرز تخاطب کو ایک لطیف پیرایہ میں نامناسب قرار دیا ہے، جس کے متعلق ادب کے ساتھ امور ذیل ملاحظہ کے لئے پیش کرتا ہوں۔

۱۔ مجھے یاد ہے میں نے ایک عریضہ میں آں محترم کی خدمت میں یہ تحریر کیا تھا کہ "جناب مجھے ان الفاظ میں سے یاد فرماتے ہیں جو مشائخ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں"۔ اب جناب نے مذکورہ بالا تنبیہ سے "عطائے تو بہ لقائے تو" کی ایک بڑی نفیس اور عمدہ شرح فرما دی۔

۲۔ میرے مخصوص جذبات کے ماتحت یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ جو کچھ جناب کو تحریر کیا جاتا ہے، حقیقت میں جناب اس سے ارفع و اعلیٰ ہیں، اس لئے اس تنبیہ پر جو انتہائی تواضع اور انکسار کی ترجمان ہے عمل نہ کرنے میں

---

[1] ۲۰ اپریل ۱۹۴۸ء (مطابق مہر ڈاک خانہ)

مجھے معذور تصور فرمانے کی گنجائش ہے۔

۵۱ جب حدیبیہ کا صلحنامہ مرتب ہونے لگا تو یہ الفاظ لکھے گئے
ھذا ماقاضی محمد رسول اللہ۔ اس پر مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ ہم اگر آپ کو رسول اللہ تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا ہی کیا تھا۔ آپ کو محمدؐ بن عبداللہ لکھنا چاہیئے۔ حضور نے فرمایا میں رسول اللہ بھی ہوں اور ابن عبداللہ بھی، پھر حضرت علیؓ سے فرمایا کہ لفظ رسول اللہ محو کر کے "ابن عبداللہ" لکھ دو حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں فرمایا لا واللہ لا امحون ابدا۲ یہ سن کر حضورؐ اپنے دست مبارک سے اصلاح فرمادی۔

۵۴ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، حضرت رسول اکرمؐ تشریف لائے اور حضرت ابوبکر کو بدستور امامت فرمانے کا امر فرمایا۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹ گئے۔

ان دونوں واقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ و حضرت ابوبکر نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ان سلوک الادب اولیٰ من امتثال الامر الذی لیس للوجوب حاصل یہ کہ کبھی تو امر فوق الادب ہوتا ہے اور کبھی ادب فوق الامر۔ اس ناقابل انکار حقیقت کے ماتحت اگر راہِ ادب اختیار کر دل تو نہ صرف یہ ہو گا کہ

۵۱ یہ ہے رسول اللہ صلعم کا صلحنامہ (با محاورہ ترجمہ)

۵۲ بخدا میں ہرگز محو نہ کروں گا۔

۵۳ راہِ ادب اختیار کرنا اس امر کے امتثال سے بہتر ہے جس پر عمل کرنا واجب نہ ہو۔

میں عتاب کا مستحق نہ ہوں گا بلکہ نظیری کے اس مصرع کو پڑھنے کا بجا طور پر حقدار ہوں گا۔ ع

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

یہ بات میرے اختیار سے باہر ہے کیونکہ تقاضائے عقلی کی طرح طبعاً بھی مجھے مخلص اصحاب کمال اکابر و احباب کا غیب و شہود میں تحریراً و تقریراً بہت زیادہ احترام ملحوظ رہتا ہے۔

محمد اسعد اللہ

(۵)

۲۰ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ہجری[1]

.... امید ہے کہ گذشتہ قسطیں ملاحظہ سامی سے مشرف ہو چکی ہوں گی بسلسلہ ما سبق عرض ہے کہ جناب کے اُس والا نامے سے اتنا اثر ضرور ہوا کہ میں اس وقت گذشتہ درخواست کا اعادہ کرنے میں ایک خاص قسم کی جھجک محسوس کرتا ہوں، اس سلسلہ میں اگرچہ ابھی کچھ گوشے ایسے رہ گئے ہیں جو بے نقاب نہیں ہوئے، لیکن اس اندیشے سے مبادا طبع والا پر گرانی ہو۔ ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

ایک مرتبہ حسرتی یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہوا، غالبؔ مومنؔ اور مفتی صدرالدین وغیرہ سب اس میں شریک تھے، مرزا نے مصرع مطروحہ کو مقطع میں تضمین کیا ہے

گفت بحکم حسرتی غالب خستہ ایں غزل　　　شادیٔ ہیچ میشود طبع وفا سرشت ما!

---

[1] ۳ر مئی ۱۹۴۸ء (مطابق مہر ڈاک خانہ)

میں نے اس واقعہ کو مصرعہ ثانی کی وجہ سے نقل کیا ہے، جناب کا بلند مذاق مجکو مجبور کر رہا ہے کہ میں عربی کا یہ شعر بھی تحریر کراؤں جو غالباً منصور حلاج (منصور کا ہے)[۱]

قلیل منك یلفینی ولکن　　　قلیلك لا یقال له قلیل[۱]

اگرچہ خود ستائی ہے مگر کسی نہ کسی درجہ میں اظہار واقعہ بھی ہے اس لئے عرض کرتا ہوں کہ میری طبیعت کا بھی کم و بیش یہی حال ہے، اکابر و احباب کی عنایات و احسانات کا کم از کم اعتراف تو ضروری سمجھتا ہوں، اسی افتاد طبیعت کے ماتحت میں جگر صاحب کی غائبانہ ہمدردیوں کے شکریہ سے اپنے قلب کی گہرائیوں کو مملو پاتا ہوں، جناب موصوف کی غائبانہ ہمدردی اور مخلصانہ مشورہ انسانی شرافت کا ایک بہترین نمونہ ہے، گو میں پہلے بھی کسی عریضے میں جناب کے توسط سے ممدوح کا اجمالاً شکریہ ادا کر چکا ہوں، لیکن دل کے صحیح تقاضوں نے مجبور کیا کہ حروف بالا تحریر میں لائے جائیں۔ وقد قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ من لم یشکر النّاس لم یشکر اللہ .... اور چونکہ مجکو یہ عزت جناب کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے، اس لئے جناب بھی شکریہ کے مستحق ہیں جزاك اللہ

محمد اسعد اللہ

---

[۱] آپ کا قلیل بھی مجھے کافی ہے لیکن آپ کے قلیل کو قلیل نہیں کہا جا سکتا۔

[۲] جو بندوں کا شکر گذار نہیں وہ خدا کا بھی شکر گذار نہیں۔

(۶)

لہ
۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۶۷ھ ہجری

خوں کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسمِ گل آگ زنداں میں بیٹھے کیا کریں

یہ فانی صاحب کا شعر ہے اور میں صرف اسی کو لکھنا چاہتا تھا، مگر چونکہ مجھ کو ان کی اسی غزل کا ایک اور شعر بھی پسند ہے، اس لئے جناب کی تفریح طبع کے لئے اس کو بھی سپرد قلم کرتا ہوں

ظرف ویرانہ بقدر ہمت وحشت نہیں
لاؤ ہر ذرہ میں پیدا وسعت صحرا کریں

انتہائی خلوص اور بے تکلفی کے سبب ایک بات اور دریافت طلب ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں "لاؤ" زیادہ موزوں ہے یا "آؤ" اور دونوں میں کیا فرق ہے، اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی یاد آگئی، ہندوستان کے مسلم الثبوت اور مایۂ ناز شاعر حضرت حسرت مدظلہ کا شعر ہے

لہ ۳ مئی ۱۹۴۸ء (مطابق مہر ڈاک خانہ)

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی ہے مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی

بعض طلبہ جناب سے دریافت کرتے ہیں کہ "اک طرفہ" بہتر ہے یا "کیا طرفہ" زیادہ بہتر ہوتا۔ معاف فرمایئے ایک بات اور یاد آگئی، حسرت صاحب فرماتے ہیں ؎

شرح بے مہری احباب کہوں کیا حسرت رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

دریافت طلب امر یہ ہے کہ "شرح کہنا" محاورہ ہے یا نہیں ؟

اس طویل و عریض جملہ معترضہ کے بعد مطلب اصلی کی طرف رجوع کرتا ہوں، فانیؔ صاحب اسی غزل میں فرماتے ہیں ؎

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا، اب یہ بتا، ہم کیا کریں؟

مجھے اپنے مخصوص ماحول کے ماتحت، بہ نسبت اس شعر کے پہلے دو شعر زیادہ پسند ہیں۔ معاف فرمایئے آج تو میں تمام خط میں ابتدا ہی سے بہک رہا ہوں، ملاحظہ فرمایئے، ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

میرے خیال میں اس شعر کے دو مطلب ہیں (۱) عشق و محبت میں بیباکی و گستاخی کی گنجائش نہیں ہے، ہر حرکت و سکون، ادب و شائستگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیئے۔ (۲) عشق میں کسی قاعدہ اور اصول کی پابندی نہیں، ہر بات جو دوسری جگہ ناجائز ہو یہاں جائز ہے۔ عاشق جو کرتا ہے وہی ادب ہے۔ حضرت اصغر فرماتے ہیں ؎

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

ولنعم ما قال غالب الدہلوی ؎

جب کرم رخصت بیباکی وگستاخی دے
کوئی تقصیر، بجز خجلت تقصیر نہیں

ابھی ایک بزرگ کا مقولہ سنا کہ "محبت خود اپنے لئے ضوابط تیار کرتی ہے اور عشق اپنے لئے خود قواعد بناتا ہے" واقعی محبت کی ہاہوش دیوانگی کا اقتضا یہی ہے۔ قال الحافظ ؎

از دلق پوش مدرسہ نقد طلب مجو | یعنی ز مفلسان سخن کیمیا مپرس
ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم | از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

افسوس کہ یہ قسط بے معنی ہو کر رہ گئی، کارڈ میں اسسے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

محمد اسعد اللہ

(۷)

۵ مئی ۱۹۴۳ء

.... مولانا حالی نے لکھا ہے کہ " نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا عبد الصمد (مرزا غالب کے شفیق استاد) نے ایک خط میں جو انھوں نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا " اے عزیز چہ کسی ؟ کہ با ایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر میگذری "۔ میں اپنے محترم کو یہ لکھتا ہوں کہ " اے محترم چہ کسی ؟ کہ باوجود ایں آزادیہائے طبعی و بیگانگی ہائے فطری اکثر و بیشتر بخاطر میگذری خصوصاً دریں ولا "۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے ؎

وکل مصیبات الزمان وجدتھا
سوی فرقۃ الاحباب ھینۃ الخطب

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے ؎

لہ اور میں نے زمانے کی تمام مصیبتوں کو مفارقت احباب سے کم حیثیت پایا ہے۔

قصد ہے کہ آج اس سعی حاصل "وتطویل لاطائل" کو معذرت خواہی کے ساتھ ختم کر دیا جائے۔

کسی استاد کا شعر ہے ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ۔۔۔ چنانکہ حرف عصا گفت موسی اندر طور

اب میرا وہ تصرف بیجا بھی ملاحظہ فرمایئے جو مطابق واقعہ ہے ؎

نبود گرچہ حکایت لذیذ اے اسعد

ولے بحکم ارادت دراز تر گفتم

محمد اسعد اللہ

۱؎ دو چیزیں دوستوں کی جدائی اور جوانی کی گم شدگی ایسی ہیں کہ اگر ان پر میری آنکھیں خون کے آنسو روتے روتے اندھی بھی ہو جائیں تو میں ان دونوں چیزوں کے حقوق کا دسواں حصہ بھی ادا نہ کر سکوں گا۔

(۸)

۲۵؍رمضان ۱۳۶۷ھ ہجری[1]

.... باوجود گوناگوں مشاغل، فی الجملہ انتشار طبع اور سکون مطلوب کے فقدان کے اس وقت یہ تہیہ کرکے بیٹھا ہوں کہ آج ضرور آں محترم کی خدمت میں عریضہ لکھ کر اٹھوں گا، خواہ پورا عریضہ ہو یا اس کا کوئی معتد بہ حصہ، تاخیر جواب کے لئے گو میں پہلے معذرت نامہ میں کچھ عرض کرچکا ہوں، لیکن اس وقت تو شرمندگی سے معذرت نہ کرنے کو بھی کافی سمجھتا ہوں۔

یہ بھی ایک دل کش اور لذت آفریں حقیقت ہے کہ کبھی کبھی تاویلوں کا تو ذکر کیا، واقعی اعذار پیش کرنے سے بھی "اعتراف جرم" و اقرار خطا" کہیں زائد بامزہ، پرکیف، اور ادب و احتیاط کا جامع ہوتا ہے ؎

گناہ گرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است (حافظ)

---

[1] ۲؍اگست ۱۹۴۸ء

سے تا منفعل زر بخش بیجا، نہ بنیمش
می آرم اعتراف گناہ بیودہ را (نظیری)

عارف رومی کا ایک مصرع یاد ہے، دوسرے مصرعہ کے نہ لفظ محفوظ ہیں نہ معنی۔
ایں خطا از صد صواب اولی تراست

دو ملفوف گرامی یکے بعد دیگرے عزت بخش ہوئے...... میں نے جناب والا کے والا نامہ کو سر بند ہی محفوظ رکھا، وجہ یہ تھی کہ میں اُس وقت مدرسہ کے دفتر میں تھا جس طرح میرے لئے اس دفتر کو "دفتر بے معنی" کہنا دشوار ہے بالکل اسی طرح "با معنی" کہنا بھی مشکل ہی ہے سے

دیکھا اسے کو خلوت وجلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ با معنی کہنا بے معنی کہنے سے دشوار تر ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ "اخلاص و تصحیح نیت" کی دولت سے مالا مال فرمائیں تو دفتر کی دیکھ بھال تکفیر سیئات کا ایک بہترین ذریعہ ہے، باقی میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔

خیر، دن کے ایک بجے دفتر بند ہوا، ٹھیک[۳] اسی وقت مولوی الطاف الطاف صاحب[۱]، مولوی انعام صاحب[۲] اور میاں محمد اللہ جمع ہوئے اور لفافہ

۱؎ جناب مولانا کے ایک شاگرد۔ ۲؎ مولوی انعام الرحمٰن صاحب کا تعارف "پیش لفظ" میں کرایا جا چکا ہے۔ یہ خطوط زیادہ تر ان ہی کے قلم کے ہیں۔

۳؎ عزیزم مولوی محمد اللہ سلمہ۔ جناب مولانا کے صاحبزادے۔

کھولا گیا۔

حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے "سرودِ زندگی" کی تقریظ کے آخر میں تحریر فرمایا ہے:"محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے۔ میں نے اصغر صاحب کے کلام میں حسن وخوبی پائی، میرا فرض تھا کہ اس کی شہادت دوں"۔ آب زر سے لکھنے کے لائق، بہت ہی سچا اور ناقابل انکار ارشاد ہے۔ لہذا میرا بھی فرض ہے کہ آں محترم کے ادبی شاہکاروں (والاناموں) کے حُسن وخوبی کی داد دوں، مجھے گماں غالب ہے کہ میں نے اس رائے کے قائم کرنے میں مبالغہ آفرینیوں اور حُسن ظن کے بدنما داغوں سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا ہے۔

یہاں تک لکھنے کے بعد طرفین کے مصالح کے پیش نظر یہ بہتر معلوم ہوا کہ اس عریضہ کو قسط اول قرار دے کر ارسال خدمت کر دیا جائے۔

محمد اسعد اللہ

(۹)

۲۸ رمضان ۱۳۶۷ھ ہجری[1]

.... اختصار کے پیش نظر، گرد و پیش کے حالات و واقعات سے قطع نظر کرکے اصل والا نامہ کا جواب پیش کرتا ہوں۔

"گلستاں" کے باب پنجم میں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک حکایت کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے "یاد دارم کہ در ایام جوانی، چنانکہ افتد و دانی گذر داشتم در کوئے و نظر بر روئے"۔ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ بعض ایرانی نژاد اس عبارت کو پڑھ پڑھ کر وجد کرتے تھے اور جھومتے تھے........

آنمحترم یقین فرمائیں کہ تقریباً تمام والا نامے نے یہی وجد آور اور مسحور کن کیفیت پیدا فرمائی....... میرے لئے اب صرف یہ چارہ کار رہ جاتا ہے کہ جناب ہی کے الفاظ کا اعادہ کروں۔

غالباً اس موقع پر مندرجہ ذیل واقعات کا اجمالی تذکرہ بے محل نہ ہوگا

---

[1] ۵ اگست ۱۹۴۸ء

سہارن پور کی ایک بزم مشاعرہ میں جو نواب عادل خاں صاحب کے یہاں اب سے کم و بیش پچیس سال قبل منعقد ہوئی تھی، بدقسمتی سے احقر بھی شریک ہوا تھا۔ دو پارٹیاں برد آزما تھیں، کھلم کھلا ایک دوسرے پر حملے اور چوٹیں ہو رہی تھیں، بے تکلف ناموزوں فقرے کسے جا رہے تھے کہ ایک صاحب نے اسی ہنگامہ کارزار میں یہ مصرع پڑھا۔

پڑھنے کا جب مزہ ہے کہ اپنا کلام ہو

دوسری پارٹی کے ایک کسی قدر سنجیدہ فرد نے مخصوص لہجے میں اور خاص جنبش چشم و ابرو کے ساتھ اسی مصرع کا اعادہ کر دیا کہ جی ہاں

پڑھنے کا جب مزہ ہے کہ اپنا کلام ہو

تھانہ بھون میں ایک مرتبہ خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب تشریف فرما تھے۔ ہم لوگ عام طور پر ان کو "خواجہ صاحب" خواجہ صاحب" کہا کرتے تھے، اِن کے ایک بہت بے تکلف دوست نے ایک خاص مجمع میں ان کو ان لفظوں سے خطاب کیا" خوجہ صاحب، خوجہ صاحب" خواجہ صاحب نے بیساختہ فرمایا" الف کہاں کھا گئے۔" یہ آخری واقعہ محض حاضر جوابی اور تھانہ بھون کی مناسبت سے نقل کر دیا گیا۔

جناب نے جگر صاحب کے تذکرہ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے:" اکثر فرماتے ہیں کہ میری زندگی مسلسل بدعملی اور بے عملی میں اتنی زیادہ بسر ہوئی ہے کہ کوئی مستقل طور پر نہیں کر سکتا۔" جگر صاحب کا یہ قول ان کے ایک اچھے اور مستحسن صلاحیتوں والے انسان ہونے کا ثبوت ہے، مگر باوجود اس کے مجھے

موصوف کی یاس وقنوط سے اختلاف ہے جس شخص کے احساسات اس قدر بیدار ہوں اور وہ قدرت کی تربیت وامداد سے مایوس ہوجائے، سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ میں دعوی سے عرض کرتا ہوں کہ جگر صاحب نہ صرف یہ کہ ہر کام کو مستقل طور پر انجام دے سکتے ہیں بلکہ قابل تقلید طریقہ پر باحسن وجوہ ایک مثال قائم فرما سکتے ہیں ؎

وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا　　ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

بہر کارے کہ ہمت بستہ گردد　　اگر خارے بود گلدستہ گردد

عشق کی دشواریوں نے کر دیا کامل مجھے
اب کوئی مشکل نظر آتی نہیں مشکل مجھے

یہ شعر میرا ہی کہا ہوا ہے۔

جگر صاحب اس کا تو انکار نہیں فرما سکتے کہ ان میں استقلال کا کافی مادہ ہے، ورنہ بقول ان کے مسلسل بے عملی میں کیسے استقلال ہوتا، اب اس استقلال کی باگ دوسری جانب موڑ دیں، صرف اتنا سا کام کیا مشکل ہے "دل یا ور" کی حاجت ہے۔ ہاں غالباً ذہنی تربیت وتصور کے ساتھ شاید ایسی صحبت کی بھی قدرے ضرورت ہے، جس میں استقلال مطلوب عملاً ہو مجھے احساس ہے کہ ان الفاظ کی نگارش میں اپنے حدود سے بڑھ گیا ہوں، معاف فرمایا جائے مگر میرے اخلاص و صدق نیت پر کوئی شبہ نہ کیا جائے۔

میں اپنے استفسارات کے اطمینان بخش جواب پاکر بہت ممنون و مسرور ہوں۔
غالباً اب عربی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا ہو گا۔
اب بسلسلۂ "تفریحات" لکھتا ہوں۔ کسی رسالہ میں فارسی کا یہ شعر نظر سے
گذرا، ؎

یارم بخانہ آمد و جام شراب نیست　　　　در حیرتم کہ صبح دمید آفتاب نیست

مجھے اچھا معلوم ہوا، جناب کی ضیافت طبع کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تین
شعر اور لکھتا ہوں، جو مجھ کو نہ معلوم کب سے یاد ہیں ؎

آں شوخ سرخ جامہ سوار سمند شد　　　　یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد
(لا اعلم)

بگولے اس لئے منڈلا رہے ہیں میرے مدفن پر　　　　کہ یہ دھبا بھی کیوں باقی رہی صحرا کے دامن پر
(ندرت میرٹھی)

یہ بھی ہے واقعہ کہ جگر ہو گیا دو نیم　　　　یہ بھی ہے سچ کہ ان کی نظر بھی چھری نہ تھی
(ندرت میرٹھی)

مجھے ان چار شعروں میں شعر اول نسبتہً بہتر معلوم ہوتا ہے۔
علامہ سیماب نے اپنی مشہور نظم "موحدِ اعظم" میں "آعوذ باللہ" تحریر فرمایا
ہے، غالباً یہ سہو ہے، اسی نظم میں ایک جگہ ہے "سرشتاً" یہ بھی صحیح نہیں معلوم
ہوتا۔ اس ترکیب سے صرف عربی الفاظ آتے ہیں جیسے۔ عقلاً، نقلاً، وقتاً فوقتاً
فطرۃً، نسبتہً، قیمتہً یا وغیرہ فارسی اردو اور دوسری زبانوں کے الفاظ میں
یہ ترکیب جاری نہیں ہوتی اور "سرشت" فارسی لفظ ہے، جس طرح "عقلاً" اور

"وقتاً فوقتاً" کی جگہ "ہر دا" اور "ہنگاماً فہنگاماً" غلط ہے، بالکل اسی طرح فطرۃً کی جگہ سرشتاً غلط ہے، یہ دونوں باتیں میں نے حافظہ کی مدد سے لکھی ہیں، مدّت ہوئی جب اس نظم کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس وقت تو بہت سے امور علاوہ "موضوع نظم" کے قلب میں کھٹکے تھے۔ موضوع نظم کے متعلق دلائل و براہین کی روشنی میں اب تک پختگی کے ساتھ وہی عقیدہ ہے جو ایک قدامت پسند کٹھ مُلّا کا ہونا چاہیئے۔

یکم جولائی ۱۹۴۷ء کے رسالہ "آج کل" میں ایس حزیں صاحب سیالکوٹی کی دو غزلیں شائع ہوئی ہیں، مقطع میں ارشاد فرماتے ہیں ؎

نگاہ عشق رہتی ہے ہمیں امروز و فردا پر
محبّت کے لغت میں دوش ہے تکوین پارینہ

غالباً "تقویم پارینہ" کی مسخ شدہ شکل ہے۔ بہت ممکن ہے کاتب صاحب کی عنایت ہو۔

کسی صاحب کا شعر ہے ؎

رہرو راہِ محبّت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

اور فصحاء کے کلام میں بھی "رہرو راہ اخلاق" دیکھا گیا ہے۔ مجھے ... پر اشکال ہے، کیونکہ لفظ "راہ" بلاوجہ مکرر ہو جاتا ہے۔ اس کی اردو نثر یہ ہوئی کہ "اے محبت کے راستے کے راستہ چلنے والے" میرے خیال میں "راہ" کے ساتھ اگر وزن پورا کرنے کے لئے "رہرو" کی ضرورت ہو تو "سالک" لکھنا چاہیئے۔ جناب کی رائے گرامی درکار ہے۔

محمد اسعد اللہ

(۱۰)

۲۳ اگست ۱۹۴۸ء

سمجھ میں نہیں آتا کہ جناب کے لئے کیا القاب لکھوں۔ یقین فرمایئے کہ میرے قلب میں اس وقت وہ کیفیتیں کارفرما ہیں جن کی نفیس و پُرکیف لطافت قدرتی طور پر الفاظ کی دسترس سے بالاتر ہے۔۔۔۔ اچھا حافظ کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

دل اندر زلف لیلیٰ بند و کار عشق مجنوں کن
کہ عاشق را زیاں دارد مقالات خردمندی

۱۸ اگست ۱۹۴۸ء کا تحریر فرمودہ مکرمت نامہ آج ۲۳ اگست ۱۹۴۸ء کو ملا ہے میں نے اور میرے رفقائے انتظار کا کیا کیا لطف اُٹھایا، نہ پوچھیے۔ میں پانچ عریضے ارسال خدمت سامی کر چکا ہوں۔

تسکین صاحب! جو مرحلے اور منزلیں برسوں میں طے ہوتیں وہ مہینوں میں طے ہو گئیں، یہ جملہ "دیوانہ" کی بڑ ہے۔ "اندکے دیوانہ باش" پر عمل ہے استغفراللہ! والانامہ کی تاخیر میں بھی مصلحت تھی۔ ع یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا۔

محمد اسعد اللہ

(۱۱)

۲۷ ستمبر تا ۲۹ ستمبر ۱۹۴۸ء

میری دلی تمنا اور مخلصانہ دعا ہے کہ جناب اور جناب کے متعلقین و احباب بہمہ وجوہ عافیت و حرمت دارین سے ہمکنار ہوں، آج بعد عصر تقریباً ۳۰ سکنڈ کے لئے جناب چچا صاحب[ا]

[ا] جناب راجہ لال صاحب، ایڈوکیٹ سہارنپور، میرے نہایت صادق و مخلص دوست تھے، ۱۲ ستمبر ۱۹۵۸ء کی صبح کو ۷۲ سال کی طویل و شدید علالت کے بعد دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے، اس لئے میں اور میرے سہارنپوری احباب ان کو احتراماً "چچا" کہتے تھے، جناب مولانا بھی اسی طرح ان سے خطاب فرماتے تھے۔ جگر صاحب نے بھی اپنے خطوط میں ان کو اسی خطاب سے یاد کیا ہے۔

چچا راجہ لال صاحب ایک قدیم و شریف کایستھ خاندان کے فرد تھے۔ انگریزی کے علاوہ فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور اردو تو گویا ان کے گھر کی زبان تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جب تک صحت اچھی رہی انجمن ترقی اردو سہارنپور کے صدر رہے۔ اردو کے تحفظ و ترقی کے پرجوش حامی تھے۔ ذوق شعری بہت پاکیزہ اور بلند تھا۔ نقاد سخن سنج، "بسیار دان" اور "بسیار گو" تھے۔ یعنی طوالت کلام میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ مذہب و مسلک کے لحاظ سے اسلام سے قریب تر تھے۔ تمام عمر مسلمانوں ہی سے تعلقات رہے ۴۸، ۱۹۴۷ء میں بھی جب بڑے بڑے روشن خیال ہندوؤں کی ذہنیت اور روش بدل گئی تھی۔ چچا راجہ لال صاحب کی وضعداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے متعصب برادرانِ وطن نے ان کو اس روش سے روکنے کے لئے قتل کی دھمکیاں تک دیں۔ مگر انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔

سے ملاقات ہوگئی اور اس مختصر وقت میں بھی جناب کا ذکر آگیا۔

سردی تو گویا اب شباب پر آگئی، یہ لکھواتے وقت ادھر میری زبان پر لفظ سردی، آیا اُدھر جناب کے "آفتاب رو" والے لطیفہ کا خیال آگیا[ا] اور اس سلسلہ میں کئی لطیفے یاد آئے۔ کم و بیش پندرہ سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ ایک صاحب نے داد طلب لہجے میں مجھ سے فرمایا کہ "آج ثابت ہوا کہ جناب جامیؒ کانے تھے۔" میں نے سادگی سے عرض کیا کہ کیا کسی تاریخ میں لکھا ہے، فرمایا کہ ان کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے ؎

پرسی کہ کرا خواہی از خیل بتاں جامی　　چشمے ست مرا آخر غیر از تو کرا خواہم

"دیکھئے "چشمے ست" فرمایا ہے، جس میں یائے وحدت ہے، لہذا معلوم ہوا کہ وہ یک چشم تھے۔" میں نے یہ سن کر ان کی شان میں نثر میں ایک معقول سا قصیدہ پڑھا۔

[ا] سہارنپور میں موسم سرما کبھی کبھی بڑی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے۔ ایک ذی علم محترم بزرگ نے مجھے فارسی کا ایک شعر سنایا۔ افسوس کہ اس وقت پہلا مصرع بالکل بھول رہا ہوں، مگر اس کا مفہوم یہ تھا کہ سردی کی شدت کو دو چیزیں دور کر دیتی ہیں۔ یعنی (مصرع ثانی) یا ردائے آفتابے یا آفتاب روئے میں نے مزاحاً عرض کیا کہ اس مصرع میں "آفتاب رو" بہت معنی خیز ترکیب ہے۔ اس سے کھلی ہوئی مراد تو نگار آتش رُخ "سے ہے، لیکن اس کے علاوہ قدیم زمانہ میں ایک قسم کی گول "آفتاب نما" "انگیٹھی" ایران میں بہت مستعمل تھی۔ اور اس کو "آفتاب رو" کہتے تھے۔ انھوں نے بہت حیرت کا اظہار کیا اور فرمایا: "واقعی! یہ تحقیق میرے علم میں نہ تھی۔" میں نے یہ لطیفہ جناب مولانا کو بھی سنایا تھا اور پھر لکھ کر بھی بھیجا تھا۔ (مکتوب ۱۱۴)

میں نے ایک مرتبہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی سے سُنا تھا کہ ایک صاحب نے کسی رئیس کے دروازے پر جاکر زنجیر ہلائی۔ ملازم باہر آیا اور نام پوچھ کر اندر چلا گیا۔ آقا نے دریافت کیا، کون صاحب ہیں؟ جواب دیا کہ "عبداللہ" آقا نے کہا کہ بندۂ خدا عبداللہ بھی کہیں نام ہوتا ہے۔ عبداللہ کہا ہوگا، ظریف الطبع اور بذلہ سنج ملازم نے کہا "کہ بیشک اس نے تو عبداللہ ہی کہا تھا، مگر چونکہ اوس کی "عین" (آنکھ) نقطہ دار ہے اس لئے میں نے صحیح تلفظ کیا (بیچارے کی آنکھ میں پھولا تھا۔)

اب سے کم و بیش ۲۵ سال پیشتر مجھکو پٹنہ عظیم آباد جانے کا اتفاق ہوا (وہی عظیم آباد جس کے متعلق مرزا داغ نے فرمایا ہے ع

عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

جناب امیر لکھنوی نے بھی داغ کی اس غزل کی تعریف کی ہے۔)

مفتی امیر احمد صاحب آمیر میرے جد اعلیٰ جناب مفتی سعداللہ صاحب کے علوم عربیہ میں تلمیذ تھے، مجھ کو اس تلمذ کی خبر جناب جلیل نے حیدر آباد میں دی تھی۔ کیا عرض کروں کہ جلیل صاحب کس قماش کے آدمی تھے۔ وہ یقیناً ایک فرشتہ صورت فرشتہ سیرت انسان تھے، عموماً حیدر آباد کے حضرات جلیل صاحب کو حافظ صاحب کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ حافظ صاحب اور جناب امیر کے صاحبزادے لطیف مینائی صاحب مرحوم مجھ سے ایسی تواضع کے ساتھ پیش آئے۔ تھے کہ میں با وجود اٹھارہ سال کی طویل مدت کے گذر جانے کے اس کو فراموش نہ کرسکا۔ ان دونوں بزرگوں کے طرز عمل سے مجھ کو معلوم ہوا کہ متقدمین اپنے اساتذہ آبا۔ اور ان کے متعلقین سے کس قسم کا شریفانہ معاملہ کیا کرتے تھے۔ (افسوس کہ میں موضوع سے دور نکل گیا)

عظیم آباد کے متعلق ذکر تھا کہ وہاں میرے والد کے ایک دوست (سدا سہاگن) درویش "پیاری" نام ملے۔ پرانے تعلیم یافتہ منتہی قسم کے آدمی تھے۔ غالباً کچھ انگریزی بھی جانتے تھے۔ ان درویش صاحب نے ازراہِ خلوص یا امتحاناً مجکو اپنی قیامگاہ پر بلانا چاہا۔ جو شرعی حیثیت سے قابل اعتراض اور اخلاقی حیثیت سے ناپسندیدہ تھی۔ میں نے ادب و تہذیب سے معذرت کی جس کو فراخ حوصلگی سے بلا پس و پیش قبول فرمالیا گیا۔ ان بزرگ نے میری استعداد کا جائزہ لے کر بہت سے فارسی کے آسان اشعار سنائے۔ اور موقع بموقع کچھ تصوّف کے نکات بھی بیان فرمائے۔ قہر درویش برجانِ درویش، میں ان کے نکات سنتا تھا اور کبھی جا و بیجا سر بھی ہلا دیتا تھا۔ گو بہت سے اشعار اور ان کے نکات فراموش کرچکا ہوں، لیکن ایک شعر اور اس کا نکتہ اب تک دماغ میں محفوظ ہے۔ فرمایا تھا: "کریما کا دوسرا شعر ہے ؎

نداریم غیر از تو فریاد رس   توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

(کریما کے متعلق دلائل کی روشنی میں میری رائے یہ ہے کہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی تصنیف نہیں ہے) مجھ سے اس شعر کا مطلب دریافت فرمایا۔ میں نے جو کچھ جانتا تھا بے تکلف عرض کر دیا۔ فرمایا: "نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ گاروں کے لئے خدا، خطا بخش ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم" میں تو بلا سمجھے ہی آمنّا و صدّقنا کہنے کے لئے تیار تھا۔ مگر جناب ممدوح نے میری بے مائگی پر نظر فرما کر خود ہی اس کی وجہ بیان فرمائی کہ "دیکھو بس کے عدد بحساب جمل باسٹھ ہیں اور نبی کے بھی باسٹھ ہی عدد ہیں۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ خدا اور نبی دونوں خطا بخش ہیں۔"

بقیۃ انشاء اللہ کل۔

محمد اسعد اللہ

(۱۲)

۳۰ / ۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء

مخلصانہ مگر ترجمان شوق، سلام مسنون قبول فرمایئے۔ منوچہری نے اپنے
استاد عنصری کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس کا ایک شعر ہے ؎

شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع

طبع او چوں شعر او ہم با ملاحت ہم حسن

میں معمولی تصرف کے ساتھ جناب کے لئے نقل کرتا ہوں ؎

شعر تسکیں مثل طبعش بے تکلف ہم بدیع طبع تسکیں مثل شعرش با ملاحت ہم حسن

یہ چند سطریں تو بطور جملہ معترضہ تھیں، اب گذشتہ سے پیوستہ مضمون املا کراتا
ہوں۔ مشہور شعر ہے ؎

روز محشر کہ جانگداز بود اولیں پرسشش نماز بود

ایک محقق ارشاد فرماتے تھے کہ یہ باز پرس ہوگی کہ نماز کیوں پڑھی تھی۔ اس پر
ایک اور لطیفہ یاد آیا، تھانہ بھون میں ایک بزرگ تھے، حضرت حافظ ضامن
صاحبؒ، جنھوں نے ہنگامۂ غدر میں جام شہادت نوش فرمایا، اب تک تھانہ بھون

ہیں ان کا مزار مرجع خواص و عوام ہے۔ انھوں نے تھانہ بھون کے ایک بے نمازی نوجوان کو نصیحت فرمائی کہ "بھائی نماز پڑھا کرو۔" اس نے ادب سے عرض کیا کہ "حضرت! میرے بھائی صاحب پڑھتے ہیں۔" حضرت نے فرمایا کہ "بھائی۔ ان کے نماز پڑھنے سے تم کو کیا فائدہ؟ نوجوان نے جواباً عرض کیا کہ "پھر میرے نماز نہ پڑھنے سے حضرت کا کیا نقصان؟"

مشہور ہے کہ ایک محقق صاحب کے دوست کی لڑائی کسی دوسرے شخص سے ہو رہی تھی دوست مقابلہ میں پہلے سے کچھ کمزور تھا۔ اس پر محقق صاحب نے یہ ستم ڈھایا کہ آگر اس کے ہاتھ پکڑ لیے، لوگوں کی باز پرس پر محقق صاحب نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ میں نے حضرت سعدیؒ کی نصیحت پر عمل کیا تھا یعنی ؎

دوست، آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی!

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ایک صاحب کی تحقیق ہے کہ مرزا صاحب نے تاریخی واقعہ نظم فرمایا ہے اور یہ انگریزوں کی دہلی میں آمد سے متعلق ہے، مطلب یہ ہے کہ افسوس ہے ایسے ...... قدم ہمارے گھر میں آئیں، کہاں ہمارا شُدھ پوتر گھر (یہ انھیں کے لفظ ہیں) اور کہاں یہ منحوس قدم!

مرزا داغ کا ایک شعر ہے ؎

ستم ہی کرنا جفا ہی کرنا، نگاہ الفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

ایک "صاحب ذوق" نے فرمایا کہ اس شعر میں دو خرابیاں ہیں ایک تو یہ کہ اپنے سر کی قسم دی، حالانکہ کہنا یہ چاہیئے تھا ع

تمھیں قسم ہے عدو کے سر کی ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

اور دوسری یہ کہ اس شعر کے آخر میں لفظ "کمینہ" پیدا ہو جاتا ہے۔

ان شعر فہم اصحاب ذوق کا تذکرہ ضمنی طور پر آگیا تھا۔ کل انشاءاللہ یہ موضوع بدل جائے گا۔

محمد اسعد اللہ

(۱۳)

یکم جنوری ۱۹۴۹ء

اولاً سال نو کی دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں، پروردگار عالم جناب کو اور جناب کے جملہ متعلقین کو تمام بلیات سے محفوظ و مصون رکھے (میں نے لفظ مصون کو قصداً بلا ہمزہ لکھوایا ہے، کیونکہ "مصؤن" ہمزہ کے ساتھ بالکل غلط ہے)

کل میں نے لکھوایا تھا کہ اب کسی دوسرے موضوع پر اظہار خیال کروں گا، لیکن لسلسلۂ گذشتہ بہت سی باتیں سامنے موجود ہیں جو مجھے مجبور کر رہی ہیں کہ بفحوائے "ما لا یدرک کلّہ لا یترک کلّہ"[1] دو ایک باتیں ضرور سپرد قلم کرائی جائیں۔

مرزا غالب نے فرمایا ہے اور بہت خوب فرمایا ہے ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرزا غالب کا مذکورہ بالا شعر میر کے مندرجہ ذیل مقطع سے ماخوذ ہے ؎

---

[1] جو چیز پوری نہ مل سکے اس کو بالکل چھوڑا بھی نہ جائے۔

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر   یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

ایک منطقی صاحب نے غالب کے شعر کے متعلق فرمایا تھا کہ غالب کو یوں کہنا چاہیئے تھا ؎

کی مرے قتل سے قبل اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور توجیہہ یہ فرمائی تھی کہ غالب کے شعر میں معشوق پر بیجا طعن و تشنیع ہے، اور اپنے قتل پر اظہار افسوس، حالانکہ دونوں باتیں عاشق کی شان کے خلاف ہیں۔ نیز "اَن نیچرل" بھی ہے کہ قتل ہونے کے بعد بول رہے ہیں۔ اب اصلاحی تصرف کے بعد نہ صرف یہ کہ دونوں سقم دور ہو گئے بلکہ تمنا و شوق قتل کا بھی اظہار ہو گیا۔

محمد اسعد اللہ

(۱۴)

۲ر تا ۵ر جنوری ۱۹۴۹ء

اس وقت ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۸ء کا والانامہ میرے سامنے موجود ہے، جناب نے اس والانامہ میں یہ مژدہ ذوق پرور بھی تحریر فرمایا تھا کہ آج کل جگر صاحب اپنا تازہ مجموعہ کلام "نسیم جگر"[۱] چھپوانے کا انتظام کر رہے ہیں۔" یا ردئے آفتاب یا آفتاب روئے" والا لطیفہ بھی جناب نے اس والانامہ میں تحریر فرمایا ہے۔ میں اس والانامہ کا جواب نہیں دے سکا جس کے لئے بہت متاسف ہوں۔

میں نے ندرت صاحب میرٹھی کا ایک شعر لکھا تھا ے

بگولے اس لئے منڈلا رہے ہیں میرے مدفن پر
کہ یہ دھبہ بھی کیوں باقی رہے صحرائے دامن پر

اس سلسلہ میں جناب نے حضرت عزیزؔ[۲] لکھنوی کا یہ شعر رقم فرمایا ہے ے

---

[۱] جگر صاحب نے اپنے جدید مجموعہ کلام کا نام چھپوانے سے پہلے "نسیم جگر" رکھا تھا پھر رائے بدل گئی اب یہ کلام "آتش گل" کے نام سے شائع ہوا ہے [۲] حضرت استاذی مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی مرحوم۔

بتا اے خالق ارض و سما کیا کام آئے گی
مری ہستی کہ اک دھبّہ سا ہے دنیا کے دامن پر

واقعی عزیز صاحب کا شعر بلند و نادر ہے۔

مجھے میرٹھ میں ندرت صاحب سے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا ہے! سادہ مزاج اور بے تکلف انسان ہیں[۱]۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کے والد ماجد جناب مولانا شوکت میرٹھی کے متعلق بھی دو چار باتیں پڑھنے کی جناب کو زحمت دوں۔ مختلف حضرات سے سُنا ہے کہ مولانا شوکت رامپور منہاران ضلع سہارنپور کے باشندہ تھے، عموماً میرٹھ میں قیام رہتا تھا، مولانا نے دیوان غالب کی شرح بھی فرمائی تھی۔ میں نے اس شرح سے اس وقت فائدہ اٹھانے کی سعی کی جب میرے ہوش و شعور کا ابتدائی زمانہ تھا۔ دیوان غالب کے متعلق سب سے پہلے میں نے اس شرح کو دیکھا تھا۔ پھر مجھے دو شرحوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ایک مولانا طبا طبائی کی، دوسری مولانا الحاج حسرت موہانی کی

---

[۱] مولانا شعیب احمد صاحب نُدرت مرحوم میرٹھی سال وفات جون ۱۹۵۴ء ہے۔ نہایت ماہر فن اور خوش کلام شاعر تھے۔ بے تکلف خوش مزاج۔ باہمہ و بے ہمہ، مجھ سے اختصاص کامل رکھتے تھے۔ میرے سلام کے جواب میں مولانا مرحوم نے ایک فارسی قطعہ لکھ کر بھیجا تھا۔ بطور یادگار درج کیا جاتا ہے ؎

قطعہ

بادہ بلند ترید و عالم مقام تو
از ما ہمیں دعاست جواب سلام تو

سامان صد مسرت و تسکین پیام تست
از ما دعائے خیر جواب سلام تست

ندرت: ۱۴ اپریل سنہ ۵۲ء

اوّل الذکر بزرگ سے میں نے حیدرآباد میں شرف نیاز حاصل کیا تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا تھا کہ وہ میرے خاندان کے بزرگوں سے واقف ہیں۔ نظم صاحب نے فرمایا تھا کہ سب سے پہلے ہم نے دیوان غالب کی شرح کے لئے قلم اٹھایا تھا۔ اب تو بہت شارح پیدا ہو گئے ہیں۔ حسرت صاحب سے ایک مرتبہ بریلی میں اور دوسری مرتبہ مکہ معظمہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن ایسی ملاقات جس کو بمشکل ہی عرف عام میں ملاقات کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ حسرت صاحب نے اپنی شرح میں تحریر فرمایا ہے کہ مجھکو مولانا شوکت صاحب کی شرح سے کم فائدہ ہوا اور نظم صاحب کی شرح سے زائد۔ میں نے مولانا شوکت کا شرح دیوان غالب ہی میں یہ اعلان دیکھا تھا کہ جو صاحب جس درجہ کا کلام بھیجیں گے اوسی درجہ کی اصلاح دی جائے گی۔ کلام خواہ فارسی کا ہو خواہ اردو کا۔ میں نے مولانا کی اصلاحات کے متعلق بہت سنا ہے، اب جو محفوظ ہے وہ جناب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ جناب ذوق کا شعر ہے۔ ؎ جانور جو ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے

اے شہ حسن وہ اڑتے ہی ہما ہوتا ہے

مولانا نے تحریر فرمایا، یہ غلط ہے جانور کے عموم میں تو گائے بیل کتّا اور بلّی بھی آتے ہیں۔ لیکن ان کو ہما سے کچھ نسبت نہیں، یقیناً انھوں نے یوں فرمایا ہوگا ؎

زاغ بھی گر ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے

اے شہ حسن وہ اڑتے ہی ہما ہوتا ہے

(آب حیات میں جناب آزاد نے جناب ذوق کو بیا ہی زادہ تحریر کیا ہے، لیکن صاحب "خمخانۂ جاوید" نے اس کی تردید کی ہے) میرے ایک دوست فرماتے ہیں کہ اس

اصلاح کے پیشِ نظر شاید زاغ سے بوم بہتر ہے ؎

کس نیاید بزیرِ سایۂ بوم　　　ور ہما از جہاں شود معدوم

امیر احمد صاحب (لکھنوی) نے فرمایا تھا ؎

غضب داغ تو نے دیا اے فلک　　　کلیجہ گل نیلوفر ہو گیا!!

مولانا (شوکت) نے فرمایا۔ پہلے مصرع کو یوں بدل دیجئے ؎

غضب چٹکیاں ہیں تری ای فلک　　　کلیجہ گل نیلوفر ہو گیا

داغ صاحب نے فرمایا تھا ؎

لگا ہے سنگ مقناطیس گویا　　　جبیں اٹھتی نہیں اس آستاں سے

مولانا نے فرمایا مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے نہ کہ سر کی کھال کو۔

(میں نے داغ و امیر کے متعلق مختلف اہلِ قلم و اہلِ فن حضرات کے مضامین دیکھے ہیں اور ان دونوں نام آور شاعروں کے مزارات کی بھی حیدرآباد میں زیارت کی ہے۔ شاید دونوں مزاروں کے درمیان دس بارہ گز کا فاصلہ ہوگا)

غالباً بیباک شاہجہانپوری کا شعر ہے ؎

وہ بلبل خوش لہجہ ہوں سن کر مرے نغمے　　　ہیں جھومنے لگتے شجر کوئے محمدؐ

مولانا نے دوسرے مصرع میں تصرف فرما کر شعر کو اس طرح بنا دیا ؎

وہ بلبل خوش لہجہ ہوں سن کر مرے نغمے　　　جھوما کئے برسوں شجر کوئے محمدؐ

میں نے جو سنا تھا وہ عرض کر دیا ہے۔

اسی مضمون کے مناسب ایک اور سُنی ہوئی بات یاد آگئی، جناب آتش کا شعر ہے ؎

ہر ایک دل میں پیارے تیرا مقام نکلا
تو ہم سے بھی زیادہ رسوائے عام نکلا

خواجہ وزیر نے فرمایا کہ جب دل میں مقام ہوا تو رسوائی کے کیا معنی؟ یوں ہونا چاہیئے ؎

ہر ایک کی زباں سے تیرا ہی نام نکلا
تو ہم سے بھی زیادہ رسوائے عام نکلا

نیاز ناموں کی رسید کا انتظار ہے۔

محمد اسعد اللہ

(۱۵)

۶ و ۷ جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

مومن کا مطلع ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مومن ہی کا یہ شعر بھی ہے ؎

پڑا ہو مرنا ہمیں بس ایتو کہ اس نے خط پڑھ کے نامہ بر سے
کہا اگر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر اتنا رقم نہ ہوتا

میں جس طرح تمام اساتذۂ فن کا احترام کرتا ہوں اسی طرح جناب مومن کا بھی خاص معتقد ہوں۔ مجھے ان کا یہ شعر بہت ہی پسند ہے جو انھوں نے اپنی محبوبہ کے مرثیہ میں فرمایا ہے ؎

دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں
وہ قدر دانِ شکوۂ بے جا نہیں رہا

(میں نے لفظ "شکوہ" کا یہ املا تقلیداً لکھا ہے) "قدر داں شکوۂ بیجا" اپنی آغوش

میں بے پناہ معنویت لئے ہوئے ہے۔ معشوق تو شکوہ سے گھبراتا ہے، قدرداں تو کیا ہو گا۔ اور پھر "شکوۂ بیجا" کا، اس پر طرّہ یہ کہ شکوۂ بیجا یہ تھا کہ دل میں جگہ نہیں۔ یعنی دل میں جگہ تھی، لیکن وہ ہمارے گلہ وشکوہ کو مانتا تھا۔ اس کی قدر کرتا تھا۔ نباہ اور وفا کے وعدے کرتا تھا۔ ہماری دلجوئی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتا تھا۔ (نظیری کا کیسا اچھا شعر ہے ؎

تا منفعل ز رنجش بے جا نہ بنیمش

می آرام اعتراف گناہ نبودہ را)

یعنی عشق کی جو معراج ہے کہ معشوق عاشق بن جائے، وہ ہم کو حاصل تھی جناب کی رائے اس شعر کے متعلق کیا ہے۔

مومن نے "مقاطع" میں جس قدر اپنے تخلص سے فائدہ اٹھایا ہے، شاید دوسرے شعراء کو ایسا موقع نہیں ملا ہے۔

محمد اسعد اللہ

(۱۶)

۸ر جنوری و ۱۲ر جنوری ۱۹۴۹ء

بکم جنوری ۱۹۴۹ء کا تحریر فرمودہ فصاحت نامہ شرف صدور لایا۔
اس والا نامہ کی مخصوص نوعیت اگرچہ جواب کے لیے کافی تفصیل و تطویل کی طالب ہے۔ مگر میں اس وقت اختصار ہی سے کام لینا مناسب سمجھتا ہوں۔
مجھے ندامت اور افسوس ہے کہ میں نے خدا جانے کیا غلط سلط لکھوا دیا کہ جس سے جناب کو حسب ذیل عبارت سپرد قلم کرنا پڑی۔
"سب سے پہلے نور چشمی کی تقریب عقد پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اگرچہ خود اولاد سے محروم ہوں لیکن زمانۂ حاضرہ میں والدین کی مشکلات بے پایاں کا دلی احساس رکھتا ہوں....."[1]

---

[1] اس خط میں کوئی علمی و ادبی نکات و رموز نہیں۔ اس لحاظ سے اس کو "زوائد" میں شمار کیا جا سکتا ہے، لیکن میں نے اسکو اس لئے نقل کیا ہے کہ دراصل یہ مکتوب آئندہ چند دلچسپ مکاتیب کا "دیباچہ" ہے اور اس سلسلہ کی ضروری کڑی ہے۔ جیسا کہ اگلے خطوط ۱۸، ۱۹، ۲۰ کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔ نوعیت واقعہ یہ ہے کہ مولوی انعام الرحمٰن صاحب نے جو ان خطوط کے کاتب ہیں "دفتر" کی ف کو کچھ اس طرح لکھا تھا کہ میں نے اس کو "دختر" پڑھا۔ عبارت شاید کچھ اس طرح تھی کہ خدا کا شکر ہے کہ میں دفتر کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوگیا"۔ بہرحال یہ بات میرے حافظہ و ذہن سے بالکل اتر گئی کہ جناب مولانا مدرسہ کے دفتر کا تذکرہ کئی خطوط میں فرما چکے ہیں (ملاحظہ ہو خط ۹) اور میں نے قلم برداشتہ جناب مولانا کی خدمت میں "دختر" کے عقد مناکحت کی تہنیت پیش کردی، پھر اصل غلط فہمی کا جب مجھے علم ہوا تو سخت ندامت ہوئی۔ اس احساس ندامت کو رفع کرنے کے لئے جناب مولانا نے کئی دلچسپ واقعے قلمبند فرمائے تھے ملاحظہ ہو خط ۱۷

جناب حاجی صاحب[۱]! میرے یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے اور میں کسی کے عقد سے فارغ ہوا ہوں۔ بہر حال جناب کی مبارکباد کا دل سے شکر گزار ہوں، کیونکہ اس سے قلبی اتصال اور روحانی تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

میرے عریضوں کے جواب کے لئے کچھ نہ کچھ زحمت ضرور برداشت کرنا پڑتی ہو گی اور ضروری مشاغل پر اثر پڑتا ہو گا۔ جناب یقین فرمائیں کہ نیاز ناموں کے اس تسلسل سے مقصد "جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے"۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ اس زرین مقولہ پر عمل پیرا رہوں۔ "یار باشاطر باش نہ بار خاطر"

محترمی جگر صاحب سلام مسنون قبول فرمائیں۔

محمد اسعد اللہ

---

[۱] مجھے ۱۹۳۶ء میں حج و زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا، موجودہ دور میں خصوصاً اپنے حالات و اعمال کے پیش نظر جب مجھے حاجی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے تو سخت ندامت محسوس ہوتی ہے، میری تشہیر کے لئے یہی کافی ہے کہ میں شاعر ہوں اور محکمہ پولیس میں بھی ملازمت کر چکا ہوں۔

(۱۷)

۱۴ جنوری تا ۱۶ جنوری ۱۹۴۹ء

آج صبح مولوی انعام دیوبند گئے تھے۔ لہذا میں سوچ رہا تھا کہ یہ خط میں خود لکھوں گا اور سرنامہ ظہیر فاریابی کا یہ شعر تحریر کروں گا ؎

چو، زلف یار چلیپا نویسم ایں مکتوب
کفم ز بسکہ چو برگ چنار می لرزد

دیوان ظہیر فاریابی کے متعلق یہ شعر مشہور ہے ؎

دیوانِ ظہیر فاریابی — در مکہ بدزد گر بیابی

مجھے یاد ہے کہ نول کشور پریس لکھنؤ نے ظہیر کا جو دیوان شائع کیا ہے اس کے ٹائیٹل پیج پر یہ شعر اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن بعض تحریروں میں "مکہ" کی جگہ "کعبہ" بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ سید شمس اللہ قادری کی تحقیق یہ ہے کہ اس نول کشوری مجموعہ کو ظہیر فاریابی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے ظہیر کا کلام ہے جو شیراز کا باشندہ اور صائب کا شاگرد تھا۔

علامہ آزاد بلگرامی نے ظہیر کو اوحد الدین انوری پر ترجیح دی ہے، لیکن مجدہمگر اور

امامی ہروی نے انوری کو بڑھایا ہے ؎

شعر ظہیر گرچہ سر آمد زِ جنس نظم　　　با طرز انوری نزند لاف ہمسری (مجد)

ظہیر علاوہ شاعری کے حکمت و فلسفہ میں بھی امتیازی حیثیت کا مالک تھا۔ اسی لئے صدر الحکماء کہلاتا تھا۔ ایک مرتبہ نجومیوں اور انوری نے پیشین گوئی کی کہ فلاں تاریخ کو محشر خیز طوفانِ باد آئے گا۔ ظہیر نے اس پیشین گوئی کے ابطال میں ایک رسالہ لکھا، قدرت نے ظہیر کا ساتھ دیا اور معیّنہ تاریخ پر طوفان نہ آیا، بلکہ معمولی ہوا بھی نہ چلی۔ اس پر ظہیر نے ایک قطعہ میں لکھا۔

سالے گذشت و برگ نہ جنبید از درخت　　　یا مرسل الرّیاح تو دانی و انوری

لیکن "آتشکدہ" میں اس شعر کو ادیب صابر کی جانب منسوب کر کے اس طرح نقل کیا ہے۔

در روز حکم او نہ وزید ست ہیچ باد　　　یا مرسل الرّیاح تو دانی و انوری

میرے خیال میں اقرب الی الصواب "آتشکدہ" کی نقل ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ انوری علم نجوم میں ماہر و کامل تھا۔

اہل کاشان میں ظہیر و انوری کے متعلق اختلاف رونما ہوا۔ مجد ہمگر حکم قرار دئے گئے۔ مجد نے انوری کو ترجیح دی، امامی ہروی نے مجد کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور ایک قطعہ لکھا جس کا آخر شعر یہ ہے ؎

این معجز است و آں سحر این شمع واں چراغ　　　این ماہ و آں ستارہ و این حور واں پری

شعر العجم میں یہ شعر اس طرح نقل کیا گیا ہے ؎

این معجز ست واں سحر آں شمع این چراغ　　　این ماہ و آں ستارہ و آں حور و این پری

یہ اَمامی حضرت سعدی علیہ الرحمۃ کے معاصر ہیں۔ "آتشکدہ" میں ان کے متعلق لکھا ہے "در فنِ شاعری استاذ ست"۔ مجد ہمگر نے ایک رباعی میں امامی کو شیخ سعدی پر ترجیح دی ہے، چنانچہ لکھتا ہے ع

ہرگز من و سعدی با مامی نہ رسیم

گو آذر اس فیصلہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں ؎

دریں ماجرا چیست رائے تو گفتم ستم گر بود مجد ہمگر ستم گر

علامہ شبلی نے شعر العجم حصہ اوّل کے حاشیہ میں لکھا ہے: "اور شیخ سعدی نے ناراض ہو کر کہا تھا ؎

ہمگر کہ بعمر خود نہ کردست نماز شک نیست کہ ہرگز با مامی نرسد

چونکہ جگہ خالی ہے اس لئے امام ابو حنیفہؒ کا ایک شعر لکھتا ہوں ؎

اس سلسلہ میں ایک فارسی شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

پریشاں نیستی مے گو پریشاں از ایشاں نیستی میگو از ایشاں

محمد اسعد اللہ

لہ میں نیک لوگوں سے محبت کرتا ہوں، حالانکہ میں ان میں سے نہیں ہوں، شاید کہ اللہ تعالیٰ مجھے نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔

(۱۸)

۱۸و ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء

آج کی ڈاک میں جناب والا کا صحیفہ گرامی امتیازی حیثیت سے نمایاں تھا بصد اشتیاق کھولا گیا۔ یکا یک اپنے کارڈ پر نظر پڑی۔ میں نے فوراً کہا کہ اس کارڈ پر مبارک یادِ عقد کی بنیادیں قائم ہوئی ہوں گی۔ مولوی الطاف نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ "تسکین صاحب نے دفتر کو دُختر پڑھا ہے اور واقعی یہ "دفتر" اگر "دختر" نہیں تو "دختر نما" ضرور ہے"۔ اس کے بعد والا نامہ کو با آواز بلند پڑھنا شروع کیا ہر فقرہ کو دو دو، تین تین مرتبہ پڑھتے تھے اور بقدر ذوق حظ اٹھاتے تھے۔ واقعہ کی مخصوص نوعیت نے ہماری سنجیدگی کو اولاً ایک معنی خیز تبسم میں تبدیل کر دیا، پھر بلند بانگ قہقہے لگے۔

مجھے جناب کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ یہ بات اب مستقل لطیفہ بن چکی ہے۔ اور اس کو بھی اسی سلسلہ لطائف وظرائف میں شامل کر لیا جائے۔

لفظ تبسم کی مناسبت سے مجھے یاد آیا کہ کسی جگہ قاضی عبد النبی نے اپنی کتاب دستور العلماء میں یہ شعر نقل کیا ہے ؎

پری رُخ بشکر خندہ قتل عالم کرد — بگفتمش کہ مرا ہم بکش تبسّم کرد

اصل شعر غالباً اس طرح ہوگا ؎

پری رُخ بشکر خندہ قتل مردم کرد — بگفتمش کہ مراہم بکُش تبسّم کرد

میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کے دو مطلب ہیں اور شاعر نے دونوں مُراد لئے ہیں۔ (۱) "مراہم بکُش" کی درخواست اس پری رُخ نے قبول کر لی اور فوراً تیغِ تبسم سے جسکو مصرعۂ اولیٰ میں "بشکر خندہ" کہاہے، قتل کر دیا۔ (۲) "مراہم بکش"۔ کی درخواست ٹھکرادی گئی اور لبوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی کہ سبحان اللہ آپ بھی قتل ہوں گے ؎

نازپرورد تنعم نہ برد راہ بدوست
عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

میں جناب کو عریضہ لکھتے ہوئے کسی طرح موضوع کی پابندی نہیں کر سکتا، "افسانہ زافسانہ می خیزد"۔ کا مصداق ہو جاتا ہے۔

محمد اسعد اللہ

(۱۹)

۲۲ رتا ۲۶ رجنوری ۱۹۴۹ء

میں اس وقت ۱۵ رجنوری ۱۹۴۹ء کے کرامت نامہ کی جانب متوجہ ہوتا ہوں جناب نے ارشاد فرمایا ہے "مجھے یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ آپ کو دفتری کاروبار سے دور کا بھی لگاؤ ہے۔ اور آپ کے یہاں کوئی دفتر بھی ہے"۔ جناب کو یاد نہیں رہا کہ میں نے ایک عریضہ میں "این دفتر بے معنیٰ غرق مے ناب اولیٰ" کی مدد سے چند سطور لکھی تھیں۔ میری رائے میں جناب کو تفصیلاً نہیں تو اجمالاً یہ ضرور معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اس مدرسہ میں جس کا ستر ہزار سالانہ خرچ ہے، جس میں کم و بیش صحرائی و سکنائی تین سو اوقاف ہیں، جس میں مختلف علوم و فنون کی تقریباً پچیس ہزار کتابیں ہیں، جس کے مختلف شعبوں میں پچاس سے زائد ملازم ہیں، جس کے طلبہ کی تعداد تقسیم (ملک) سے قبل عموماً ۷۰۰، ۸۰۰ کے درمیان رہتی تھی اور جس کے متعلق ایک بڑا مطبخ ہے اس کا ایک دفتر بھی تمام شعبوں کے نظم و نسق کے لئے موجود ہے۔

یہ مدرسہ پچاسی سال سے قائم ہے، قدرت کی فیاضی اور حسنِ انتظام سے

اس کو مخلص بانیوں کی طرح کارکن بھی ایسے ہی ملتے رہے جو معاصرین واقران میں دیانت وتقویٰ اور علمی قابلیتوں کے اعتبار سے امتیازی شخصیتوں کے مالک تھے اسی وجہ سے دفتر میں رواجی ضوابط اور عرفی اصول وقواعد کی زیادہ پابندی نہ تھی، لیکن چند سال سے مختلف حالات ومصالح کے ماتحت ارباب مدرسہ نے یہ ضرورت محسوس کی کہ دفتر کو زیادہ سے زیادہ باضابطہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس اہم کام کی تکمیل کے لئے جناب مولانا حافظ اکرام الحسن صاحب کاندھلوی بی اے۔ ایل ایل بی عارضی طور پر سردفتر مقرر ہوئے، بحمد اللہ یہ انتخاب بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ غالباً تین سال کے بعد یہ رائے ہوئی کہ اب کسی دوسرے شخص کو یہاں پر رکھا جائے۔ حضرات سرپرستان مدرسہ کا اجتماع ہوا، مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ قابل قابل اصحاب کے نام آئے، لیکن "منظم سازش" کہنا تو بے ادبی ہے۔ "منظم شوریٰ" کے ماتحت ؏

"قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند"

ہر چند میں نے واقعی نا اہلیت، حقیقی ناقابلیت اور ناتجربہ کاری کی بناء پر انکار کیا اور انکار پر اصرار کیا، لیکن میری آواز نہیں سنی گئی۔ اور میری قابلیت ہوشیاری اور معاملہ فہمی کی وہ تعریف کی گئی جس سے تھوڑی سی دیر کو مجھ کو خود شبہ ہونے لگا کہ اگر مجھ میں یہ جوہر پوشیدہ نہ ہوتے تو یہ حضرات کیوں ایسی قصیدہ خوانی سے کام لیتے۔ بہرحال میں نے طوعاً وکرہاً چھ ماہ کے لئے اس خدمت کو قبول کرلیا۔ حضرات ممدوحین نے میری عزت افزائی کے لئے تمام مدرسہ کا نائب ناظم بنادیا۔ نشرواشاعت،

تعلیمات و مالیات کو در و بست میرے حوالہ کر دیا۔ بہر حال دفتر میں میرے لئے مسند بچھ گئی۔ گاؤ تکیہ رکھا گیا اور میں "طمطراق" سے اس پر "جلوہ افروز" ہو گیا۔

اب میں جب دفتر میں بیٹھا تو قلعی کھلنے لگی۔ مجکو اردو کی رقمیں نہیں آتی تھیں۔ نہ لکھنا جانتا تھا نہ پڑھنا۔ خیر، رقمیں سیکھیں، مال گزاری اور لگان کو سمجھا، بیگھہ، بسوہ وغیرہ کو پہچانا۔ کچی روکڑ، روزنامچہ، کھتیان، کھتونی وغیرہ الفاظ یاد کئے۔ مقدمات کے متعلق مجھ سے مشورے ہوتے تھے۔ گو میں بہت ہوشیاری سے کام لیتا تھا، لیکن پھر بھی بعض باتیں ایسی سرزد ہو جاتی تھیں، جن سے اہلِ دفتر کو میری قانونی قابلیت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ کبھی معلوم ہوتا تھا کہ فلاں فلاں کرایہ داروں نے کرایہ نہیں دیا ان کو نوٹس دیا جائے گا، قرقی کرائی جائے گی، بیدخلی کا دعویٰ ہو گا، کبھی کلکٹر سے ملنے کی ضرورت ہوتی تھی، کبھی سپرنٹنڈنٹ پولس سے تو کبھی راشن کے افسران سے وغیرہ وغیرہ۔

میرے لئے یہ سب باتیں سوہانِ روح تھیں، مدرسہ میں تین خزانے ہیں ہر خزانے میں دو قفل ہیں، جس خزانے سے لین دین زیادہ ہوتا ہے اس کی ایک کنجی میرے پاس رہتی تھی بلکہ اب تک ہے۔ اس کنجی کی حفاظت میری لاابالی طبیعت کے لئے "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں۔ ہر خرچ میری منظوری سے ہوتا تھا۔ "وُوچرس" پر میرے دستخط ہوتے تھے۔ مجھے حساب سے نہ مناسبت نہ دلچسپی، لیکن بایں ہمہ ہیچمدانی کروڑوں کا حساب کر ڈالا، بعض مرتبہ ایک غلطی پر دو دو دن صرف ہو گئے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ ع

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

میری تمام عمر تو بسر ہوئی فَعَلَ، فَعَلاَ، فَعَلُوا میں قَالَ دراصل قَوَلَ بود میں کل فاعل مرفوع ہیں، ہیولیٰ اور صورت ہیں، ثوابت و سیارات ہیں ادویہ امزجہ ہیں، وضو اور صلوٰۃ کے مسائل ہیں، مکی مدنی، ناسخ و منسوخ کی تحقیق ہیں حدیث صحیح، حسن، ضعیف کی تفتیش ہیں، مطلع و مقطع، ردیف و قافیہ ہیں، معانی و بیان و بدیع ہیں، لیکن بزرگان مدرسہ کی "کرم ظریفی" (ستم ظریفی لکھنا سوئے ادب تھا اس لئے اس ادبی بدعت کا ارتکاب کیا) نے یہ مناسب سمجھا کہ مذکورہ بالا جدی مشغلہ کے ساتھ مجھ کو دفتری کاروبار سے بھی روشناس کرایا جائے۔ اگرچہ مجھ سے صرف ۶ ماہ کے لئے فرمایا گیا تھا۔ لیکن میری نا اہلیت نے مجھ کو دو ماہ کے اندر ہی واویلا کرنے پر مجبور کر دیا۔ مگر اکابر کی خوش تدبیریوں نے مجھ کو پورے تین سال تک اس ورطۂ مصیبت سے نکلنے نہیں دیا۔ اس اثناء میں متعدد بار مجھ سے یہ بھی فرمایا گیا کہ مشاہرہ بڑھا دیا جائے میں نے تواضعاً نہیں بلکہ واقعات کے پیش نظر عرض کیا کہ مجھ کو موجودہ تنخواہ میں بھی تامل ہے۔ کیونکہ میں مفوضہ امور کو پوری ذمہ داری کے ساتھ انجام نہیں دے رہا ہوں۔ چہ جائیکہ اور زیادہ تنخواہ لوں۔

اِس مقام پر جناب کے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک لطیفہ پیش کرتا ہوں "مشہور ریاضی داں شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ مرزا غالب کو بھی کچھ ریاضی سے لگاؤ تھا؟ مولوی صاحب نے فرمایا "جی ہاں، ان کو ریاضی سے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا خاکسار کو شعر و سخن سے ہے۔"

الحاصل کارسازِ حقیقی نے میری مضطربانہ دُعاؤں کو شرف قبول بخشا اب میں بہت کچھ آزاد ہوں۔

جناب نے اسی ۱۵ ار جنوری ۴۹ء کے والانامے میں، مبارکباد عقد کا منشا۔ اشتباہ تحریر فرما کر لکھا ہے کہ "اب سوچتا ہوں کہ آپ اور آپ کے حلقۂ احباب نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی ہوگی"۔ انشاء اللہ اس کا جواب کل عرض کیا جائے گا۔

حضرت جگر مدظلہٗ کی خدمت میں میرا اسلام قبول ہو۔

محمد اسعد اللہ

(۲۰)

۲۷ جنوری، ۲۹ جنوری، ۳۰ جنوری، یکم فروری و ۴ فروری ۱۹۴۹ء

میں جناب کو بالاجمال وہ آراء لکھے دیتا ہوں، اولاً تو ہم سب نے اس مضمون کو اجتماعاً و انفراداً بہت غور سے پڑھا۔ اور بار بار پڑھا۔ کوئی کہتا تھا کہ سہارن پور کا کوئی شاعر مزاج شخص ملا ہوگا۔ جناب نے میرے حالات دریافت کئے ہوں گے۔ اس نے کچھ "زیب داستاں" کے لئے بھی بڑھا دیا ہوگا۔ کبھی یہ وہم ہوتا تھا کہ ممکن ہے کسی نامعقول نے مذاق میں سہارنپوری سے یہ لطیفہ پیدا کرنے کے لئے "غلط مخبری" کی ہو۔ ہم سب یہ توجیہات کرتے تھے اور ہنستے تھے۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ بھی دفتری برکات میں سے ایک برکت ہے، ملاحظہ تو فرمایئے کہ مجکو اس "دفتر" نے کہاں تک پریشان کیا ہے۔ یہاں تک جناب کے والا نامہ کا جواب ہو گیا اب کچھ باتیں زائد لکھتا ہوں۔

(اس سلسلہ میں جناب مولانا نے میری تالیف قلب اور احساسِ ندامت رفع کرنے کے لئے سہو و نسیان اور قلمی و زبانی لغزشات کے

چند پُر لطف واقعات قلم بند فرمائے ہیں۔) (تسکین)

چند سال کی بات ہے کہ سیتاپور (اودھ) سے ایک مکرم دوست نے تحریر فرمایا تھا کہ "چھ ماہ سے پنشن ہو گئی ہے"۔ میں نے ضعفِ بصر اور عجلت کی وجہ سے پنشن کو "پیچش" پڑھا اور ان کو عیادت نامہ لکھنا شروع کر دیا جب آدھا خط لکھ چکا تو پھر غور سے ممدوح کی تحریر دیکھی اور اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ بقیہ خط میں اصل واقعہ لکھ کر معذرت کی، موصوف نے بھی میری خفت مٹانے کو تحریر فرمایا: "میں اپنی بدخطی کے لئے دوستوں میں بدنام ہوں"۔

ایک مرتبہ مجھ سے ایک دوست نے جو انگریزی تعلیم یافتہ ہیں، فارسی داں ہیں اور مذاق شعری بھی رکھتے ہیں حسن ظن کی بنا پر دریافت فرمایا کہ مولانا "پےپارہ" کے کیا معنی ہیں۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی اور وہ عبارت دیکھنی چاہی جہاں یہ لفظ استعمال ہوا تھا۔ اُنھوں نے مجکو یہ مصرع دکھایا

ع بیچارہ الفت میں تدبیر نظر آئی

ایک بار قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحؒ کی کتاب "مالابدمنہ" میں یہ مسئلہ پڑھا کہ سفر و اقامت میں غلام کی نیت کا اعتبار نہیں، اگر آقا مسافر ہے تو غلام بھی مسافر ہے۔ اگرچہ وہ اقامت کی نیت کرے اور اگر آقا مقیم ہے تو غلام بھی مقیم ہے۔ میں نے ذہانت ظاہر کرنے کے لئے حضرت مولانا تھانوی رحؒ سے دریافت کیا کہ حضرت اگر ایک غلام دو آدمیوں کا ہو، ان میں سے ایک مسافر ہو اور دوسرا مقیم ہو جائے تو اس صورت میں غلام

کس کے تابع ہو گا۔ حضرت نے اپنی جبلّی بے تکلفی کے ماتحت فرمایا کہ بھائی معلوم نہیں۔ پھر تیسرے دن فرمایا کہ اسعد اللہ تم نے عبد مشترک کا مسئلہ پوچھا تھا، میں نے عرض کیا کہ حضرت میں نے یہ تو نہیں پوچھا تھا۔ بلکہ یہ دریافت کیا تھا کہ اگر ایک غلام دو آدمیوں کا ہو (وغیرہ وغیرہ) حضرت نے مسکرا کر فرمایا "بندۂ خدا اسی کو تو عبد مشترک کہتے ہیں، اس صورت میں شرعاً غلام مقیم سمجھا جائے گا۔"

حضرت مولانا تھانوی ؒ نے اپنے زمانۂ امراض میں ایک خط کسی دوسرے صاحب سے لکھوایا۔ خط میں یہ جملہ بھی تھا کہ ہمّت کی ضرورت ہے، چنانچہ انھوں نے حضرت کو لکھا کہ میں بیعت کے لئے تیار ہوں۔ حضرت کو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی کیونکہ حضرت کے یہاں بیعت کے معاملے میں بہت تنگی تھی۔ درخواست بھی بمشکل منظور ہوتی تھی چہ جائیکہ خود کسی کو مشورہ دیا جائے۔ پھر اصل خط کو دیکھ کر واقعہ سمجھ میں آیا۔

اب ان مضامین کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔

جناب نے مجھ سے متعلق جگر صاحب کا ارشاد تحریر فرمایا ہے "خواہ میں اپنی بے عملی کے باعث خط نہ لکھ سکوں، لیکن وہ ان مخصوص حضرات میں ہیں جن کو میں اکثر یاد کرتا رہتا ہوں" کیا عرض کروں مجھے کس قدر مسترت ہوئی، ایسے مخلص حضرات کا یاد فرمانا صحیح معنیٰ میں موجب فخر ہے۔ جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ جناب نے تحریر فرمایا ہے کہ وہ (جگر صاحب) کبھی ان معاملات میں دنیا داری نہیں برتتے ہیں، مجھے اس کو باور کرنے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں۔

جناب موصوف کی خدمت میں سلام نیاز۔ محمد اسعد اللہ

(۲۱)

۵ر فروری ، ۶ر فروری و ۸ر فروری ۱۹۴۹ء

آج کا یہ عریضہ صرف تفریح طبع گرامی کے لئے وقف ہے۔

ایک مرتبہ میں نے جناب کو فیضی کا یہ شعر لکھا تھا ؎

اے سفر کردہ کہ در خاطر ما میگذری — ہیچ دانی کہ کجائی و کجا میگذری

جناب نے اور جگر صاحب نے اس کو بہت پسند فرمایا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے "کاروان خیال" میں اسی مضمون کا فیضی کا یہ مطلع نقل کیا ہے ؎

اے ہمنفسانِ محفل ما! — رفتید ولے نہ از دلِ ما

مجکو سفر کے متعلق صائب کا یہ شعر بہت پسند ہے ؎

جائے نہ می روی کہ دل بدگماں ما — تا بازگشتن تو بصد جا نمی رود

صائب کا ایک دوسرا شعر بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

خود را شگفتہ دار بہر حالتے کہ ہست
خونے کہ میخوری بدل روزگار کن

سفر کے متعلق مجھ کو ایک اور شعر یاد آیا ؎

چوں عزم سفر کردی و رفتی ز بر ما　　بستی کمر خویش و شکستی کمر ما

"آتشکدہ" کے مقدمہ میں آذر نے یہ شعر لکھا ہے ؎

بہ ما جز عشق بدخوباں نیاموخت　　خدا نیکی دہد استاد ما را

حضرت شاہ[1] صاحب نے "تحفہ اثنا عشریہ" میں ایک موقع پر یہ شعر تحریر فرمایا ہے ؎

روح پدرم شاد کہ میگفت باُستاد　　فرزند مرا عشق بیاموز، دگر ہیچ

حافظ فرماتے ہیں ؎

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

کوئی اور کہتا ہے ؎

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم　　اِلّا حدیث یار کہ تکرار میکنیم

گمان غالب ہے کہ جناب اس تطویل لاطائل سے ضرور اکتا گئے ہوں گے، مگر بروئے انصاف اس کا الزام صرف مجھی پر عائد نہیں ہوتا ہے، اس میں کچھ شائبہ خوبی اخلاق بھی ہے

غالباً جناب کو یاد ہو گا کہ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں، میں نے لکھا تھا کہ اس زمانہ قحط الرجال میں اگر مجھکو کوئی "مخاطب صحیح" مل جاتا ہے، تو میں تقریراً وتحریراً اپنی پُرگوئی سے پریشان کر دیتا ہوں۔ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں دعویٰ کیا تھا۔ اور ۱۹۴۹ء کی ابتدا میں اس کا مکمل ثبوت بہم پہنچا رہا ہوں۔ معذرت

---

[1] حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ دہلوی۔

خواہ ہوں، لیکن باوجود اس احساس کے میرا نفس اس پر راضی نہیں ہے کہ میں جلد اس جاذب توجّہ گرامی سلسلہ کو منقطع کر دوں۔

جناب نے لکھا ہے "آج مشاعرہ ہے اور جگر صاحب آنے والے ہیں اور ان کے دوران قیام میرا ہر پروگرام ختم ہو جاتا ہے" اس سے جناب کی جگر صاحب سے والہانہ دلبستگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے بہترین و شریف ترین تعلقات طرفین کے خلوص و کمال کی روشن دلیل ہیں۔ اگر میں ان امتیازی تعلقات پر رشک کرتا تو غالباً قابلِ ملامت نہیں ٹھہرتا۔ میں فریقین کی خدمت میں تہنیت پیش کرتا ہوں۔ صدیق صدوق[1] دنیا میں ایک ایسی نعمت ہے کہ کم از کم میرے خیال میں تو اس وقت اس سے بہتر کوئی دوسری شئے نہیں ہے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی دوسری صورت پیدا فرما دیں۔

لفظ "تہنیت" پر مجھ کو رنگون کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ کہ جب رنگون میں اُردو اخبارات کی ابتدا ہوئی تو ایک بزرگ اخبار نویس نے عید کے موقع پر تعزیت کو تہنیت کے معنی میں سمجھ کر جلی حروف میں "عید کی تعزیت" کا عنوان قائم کیا تھا۔

محمد اسعد اللہ

---

[1] سچا دوست۔

(۲۲)

۱۰ر فروری، ۱۲ر فروری و ۱۶ر فروری ۱۹۴۹ء

عموماً جناب کے ہر صحیفۂ مکرم کے ساتھ یہ حالت رہتی ہے کہ ع

گاہ پڑھنے کو اٹھایا گاہ پڑھ کر رکھ دیا

میں والا نامے کا جواب لکھنے والا تھا کہ فوراً رائے بدل گئی، جی نہیں چاہتا کہ موجودہ اضطراب و پراگندگی کی حالت میں عریضہ لکھوں۔ اس وقت "دل رابدل رہیست" کے متعلق صرف ایک بات لکھتا ہوں، جس کو جناب نے میری نزاکت طبع سے ڈر کر "کشف" کی جانب منسوب نہیں فرمایا۔ مجھ سے حضرت مولانا تھانوی نے ایک مرتبہ بیان فرمایا تھا کہ بادشاہ غازی حضرت عالمگیر نے سرمد علیہ الرحمہ کے متعلق ایک جاسوس مقرر فرمایا کہ ان کے صحیح حالات کی رپورٹ پیش کرے، کیونکہ کچھ حضرات ان کے مخالف تھے اور کچھ موافق جاسوس نے یہ شعر پیش کیا تھا ؎

برسرمد برہنہ کرامات تہمت است

کشفے کہ ظاہرست از و کشف عورت است

اب ایک حافظ کا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

گفتگو آئینِ درویشی نبود　　ورنہ با تو ماجراہا داشتیم

میرے معروضات کے متعلق ارشاد ہے "علمی و ادبی نوادر کا یہ ذخیرہ دراصل اشاعت عام کے قابل ہے۔" غالباً آزاد سہارنپوری کا شعر ہے ؎

قسمت کا دھنی ہوں کہ ملا آپ سا انسان　　انصاف یہ ہے ورنہ کہاں آپ کہاں میں

میں اس قدردانی کے لیے جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے۔ اس بہترین فرض کو ادا کرنے کے لیے حضرت حافظ سے مدد لیتا ہوں ؎

حماک اللہ عن شر النوائب　　جزاک اللہ فی الدارین خیرا

(کم و بیش تیس سال ہوتے ہیں۔ میں نے امرتسر میں مسجد خیر الدین کی یہ تاریخ دیکھی تھی ؎

زہے مسجد کہ خیر الدین بنا کرد　　بشارت ساجدانِ نیک پے را
شفیعؔ از بہرِ تاریخش رقم زد　　جزاک اللہ فی الدارین خیرا

جناب کی اس اشاعت کی رائے میں محبت کو زیادہ دخل ہے، واقعی محبت ایک ایسا بے پناہ جذبہ ہے کہ انسان اس کی روشنی میں صرف خاص محاسن کو دیکھتا ہے بلکہ بلا کسی تردد کے جملہ معائب و مثالب کو محاسن و مناقب ہی سمجھتا ہے، جناب تحقیقاً نہیں تو تقلیداً ہی یقین فرمائیں کہ میری ہرزہ سرائی ہرگز چھپنے کے قابل نہیں بلکہ چھپنے کے قابل ہے، وہ اشاعت کی مستحق نہیں بلکہ اضاعت کی مستحق ہے۔ کہاں میرے خطوط کہاں اشاعت عام ؏ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

محمد اسعد اللہ

(۲۳)

۱۷ر فروری، ۱۹ر فروری، ۲۱ر فروری ۱۹۴۹ء

؎ پری رُخے کہ لشکر خندہ قتلِ عالم کرد   بگفتمش کہ مرا ہم بہ کشتن تبسم کرد

کے متعلق جگر صاحب کی تحقیق و تنقیح بہت پسند آئی۔

میں نے مختلف مصالح کی بنا پر یہ عرض کیا تھا کہ میرے نیاز نامے اشاعت عام کے قابل نہیں جناب نے "۔۔۔۔۔۔۔"[۱] "تحریر فرما کر اس کو لاجواب لطیفہ بنا دیا۔ لفظ "لا" پر ایک شعر یاد آیا ؎

خیالاتِ دو عالم راز لوحِ دل چناں شستم
کہ شد بر تختۂ نزدیں زیک نقطہ دو خط پیدا

ایک استاد سے اس کا یہ مطلب سنا تھا کہ لوحِ قلب پر "لا" پیدا ہو گیا ہے یعنی غیر اللہ کی بالکل نفی ہو گئی ہے۔ سلمان ساوجی کا بحر ہزج مسدس سالم میں

۱؎ سوئے اتفاق سے اس عبارت پر پانی گر جلنے کی وجہ سے روشنائی پھیل گئی، اور حروف و الفاظ مٹ گئے اور پڑھنے میں نہیں آتے۔ خود مجھے بھی اب یاد نہیں کہ میں نے جناب مولانا کو کیا تحریر کیا تھا۔

یہ شعر ہے ؎

چو دیدآں لولوے لعل تو لا بر لا   بلا لائی درآمد لولوے لالا

کسی صاحب کی تک بندی بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

رأیت طفلاً علی قصیر یخجل البدر والھلالا !!

فقلت ما اسمک فقال لولو، فقلت لی لی فقال لالا

حضرت سرمد شہید سے مجمع علماء میں کہا گیا۔ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ پڑھیے، انھوں نے عادتِ مستمرہ کے مطابق لا الٰہ کہا اور خاموش ہو گئے، جب لوگوں نے اعتراض کیا کہ صرف نفی پر سکوت کرنا اور اِلٰہ برحق کا اثبات نہ کرنا غلط ہے تو فرمایا میں ابھی نفی ہی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات تک نہیں پہونچا۔

ہشام بن عبد الملک اپنی ولیعہدی کے زمانے میں حج کو گیا۔ طواف میں حجر اسود کو بوسہ دینا چاہا، مگر ہجوم کی کثرت اور ازدحام کی وجہ سے باوجود انتہائی کوشش کے ناکام رہا۔ اسی وقت حضرت زین العابدینؓ حجر اسود پر پہونچے، ان کو دیکھتے ہی سارے مجمع نے جگہ خالی کر دی۔ کسی نے ہشام سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں (جن کا احترام آپ سے بھی زیادہ ہے) ہشام نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا اور صاف انکار کر دیا کہ میں واقف نہیں

لہ میں نے ایک لڑکے کو ایک محل پر دیکھا جو اپنے حسن و جمال سے بدر و ہلال کو شرما رہا تھا میں نے اس سے پوچھا تیرا نام کیا ہے اس نے کہا لولو (موتی)، میں نے کہا لی لی (میرے لئے؟ میرے لئے؟) اس نے کہا لالا (نہیں نہیں)۔

(بنو امیہ، اہل بیت کے عروج کو پسند نہیں کرتے تھے) عرب کا مشہور شاعر فرزدق وہاں موجود تھا، اس نے ارتجالاً ایک قصیدہ پڑھا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر اس وقت لکھتا ہوں ؎

ماقال لا قط الا فی تشہدہ
لولا التشہد کانت لاؤہ نعم[۱]

قصیدہ بردہ میں ہے[۲]

نبینا الآمر الناھی فلا احد ؛ ابر فی قول لا منہ ولا نعم

یہ بے ربط اور طویل تحریر جناب کے اس "لاجواب" لطیفہ کی رہین منت ہے۔ گو اس سے متعلق کچھ باتیں رہ گئی ہیں، مگر میری لاابالی طبیعت گھبرا چکی ہے، اس لئے اب اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

محمد اسعد اللہ

---

[۱] آپ نے کبھی لفظ "لا" (نہیں) نہیں کہا، مگر تشہد میں، اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کا لا، نعم (ہاں) ہوتا۔ [۲] ہمارے نبی امر بالمعروف کرنے اور نہی عن المنکر فرمانے والے ہیں لہذا کوئی شخص ان سے نہ لا (نہیں) میں اچھا ہے نہ نعم (ہاں) میں۔

(۲۴)

۲۲ و ۲۳ فروری ۱۹۴۹ء

جناب کے صحف عالیہ کو دیکھ کر یہ شعر زبان پر آتا ہے ؎

بمانا وآں دوست کو دوستاں را   غذائے دل و راحت جاں فرستد

لفظ دوست سے ایک اور شعر یاد آیا ؎

باغباں بہرِ خدا گلدستہ پیش من میار
صحبت یاراں رنگیں یاد می آید مرا

مجکو یہ شعر رنگون کے زمانہ قیام یعنی ۳۷ء یا ۳۸ء میں بدایوں کے ایک بزرگ نے سنایا تھا۔ لفظ رنگیں سے ناصر علی کا ایک شعر یاد آگیا ؎

دیدہ ام در علم صحبتہائے رنگین صد کتاب   کردہ ام یک مصرعِ تنہا نشینی انتخاب

بے ربطی کا خیال نہ فرمایا جائے۔

آپ نے ارشاد فرمایا ہے "میرے خیال میں اگر موجودہ دور میں مذاق سخن ہی باقی رہ جائے تو غنیمت ہے" یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میرا ماحول تو ہمیشہ اس نوع خاص کے ذوق لطیف

کا دشمن رہا ہے۔ ایسے ماحول میں اگر ذوق مردہ نہیں تو پژمردہ ضرور ہو جاتا ہی میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ "مدرسہ کی چہار دیواری میں رہنے والوں کی زبان عموماً خراب نامانوس اور نا قابل تقلید ہوتی ہے۔" میرے خیال میں یہ رائے بڑی حد تک صحیح ہے۔

جناب کا یہ شعر ؎

وہ کچھ حسرتیں جو کبھی ہوں نہ پوری
نجانے محبت میں کیوں ہیں ضروری

بہت پسند کیا گیا۔ ماشاء اللہ پوری غزل مرصّع ہے۔

"ویرانی نہیں جاتی" اس ردیف اور ان قوافی میں جگر صاحب کی غزل کا انتظار ہے۔

محمد اسعد اللہ

(۲۵)

۲۴ و ۲۵ فروری ۱۹۴۹ء

مرزا غالب کے شعر "حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل الخ" کے متعلق جناب کا ارشاد "لیکن اس قسم کے اسقام سے کس کا کلام پاک ہے" مجکو بہت زیادہ پسند آیا، ماشاء اللہ بہت ہی پُر مغز اور سنجیدہ بات ہے میں اس بہترین جواب کے شریف و مہذب تاثر کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ اسقام اگر اسقام ہیں تو اسقام قولی و اسقام شعری ہیں، ان سے کیا نقصان ہے، اگر اسقام بدنی ہوں تو وہ بھی بہت زیادہ وجہ تشویش نہیں۔ اصل اور واجب الاحتراز اسقام، اسقام قلب و روح ہیں، اگر روح پاکیزہ اور قلب صاف ہو تو ان اسقام کو بھی مفید بنایا جا سکتا ہے۔

آج مدرسہ کا ششماہہ امتحان شروع ہو گیا ہے، چار پرچے میرے متعلق ہیں، بخاری شریف۔ ترمذی شریف، ابن کثیر (تفسیر) اور امور عامہ۔ مجکو سوالات کا تیار کرنا تو دشوار نہیں معلوم ہوتا، لیکن پرچوں کے جانچنے میں سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے خوف کرتا ہوں

اِدھر یہ خیال ہوتا ہے کہ مدرسہ کا امین ہوں کوئی بیجا رعایت نہ ہو جائے
اُدھر یہ خوف ہوتا ہے کہ بے زبان طلبہ کا معاملہ ہے ان کے حق میں کوتاہی
نہ ہو جائے۔ میں شک کا فائدہ ہمیشہ طلبہ کو دیتا ہوں اور جائز رعایت
سے کبھی دریغ نہیں کرتا۔ ہمیشہ کتاب سامنے رکھ کر پرچے جانچتا ہوں۔

میں اس وقت کتب خانہ میں بیٹھا ہوا ہوں، لسلسلہ گذشتہ کچھ عرض
نہیں کر سکتا۔

"آتشکدہ" میں بسم اللہ کے بعد یہ شعر لکھا ہے یہ مجھے بہت پسند ہے

در طوف حرم دیدم دی مغبچہ می گفت
ایں خانہ بدیں خوبی آتش کدہ بایستے

جگر صاحب تشریف لے آئے ہوں گے، ممدوح کی کیفیت وخیریت مطلوب ہے،

کیا سفر میں بھی جناب تحصیل عربی کا کچھ مشغلہ رکھتے ہیں، میری تمام عمر میں جناب
کی ذات گرامی اس طور پر عربی حاصل کرنے کے لئے پہلی مثال ہے[1]

محمد اسعد اللہ

---

[1] میں نے ۱۹۴۳ء میں ادارۂ تعلیمات اسلام امین آباد لکھنؤ سے ذریعہ مراسلت "زبان عربی" سیکھنا شروع کی تھی، کئی سال مسلسل یہ مشغلہ جاری رہا۔ اس سلسلہ میں عربی صرف ونحو وغیرہ کی بہت کتابیں منگا ڈالیں اور اپنے طور پر ان کا بھی مطالعہ کیا۔ اگرچہ محنت شاقہ کرنا پڑی، لیکن بفضلہ تعالیٰ اتنی استعداد پیدا ہوگئی کہ سادہ اور آسان عربی (خصوصاً قرآن کی آسان آیات کو بخوبی سمجھ لیتا اور صحیح ترجمہ کر لیتا ہوں۔ استاذی (باقی نوٹ ص۵ پر دیکھیے)

(۲۶)

یکم مارچ ۱۹۴۹ء

۱۷ر فروری ۴۹ء کا والانامہ پیش نظر ہے، ایک مصرعہ ملاحظہ فرمایئے ؎ مارا ازیں جہاں بجہاں دگر رساند
اس وقت اس کی تفصیل دل میں ہے، لیکن زبان قلم پر لانا دشوار ہے۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ایک مرتبہ جیل سے باہر آکر یہ شعر پڑھا تھا ؎

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
ہم میکدہ سے نکلے کہ دنیا بدل گئی

(بقیہ نوٹ ص ۷۹ ملاحظہ فرمایئے)

جناب مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی ناظم ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ میری ترقی کی رفتار کو دیکھ کر بہت مسرور ہوتے۔ اور تعریفی الفاظ لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرماتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب قبلہ کو بھی میں اپنے اس "علمی کارنامہ" کی روداد لکھ لکھ کر بھیجتا تھا۔ جناب مولانا نے بھی اکثر ان خطوط میں میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ بلکہ متعدد خطوط میں عربی عبارتیں اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے مجھکو لکھ کر ارسال فرمائیں۔ اور میرے مرسلہ ترجمہ کو بنظر استحسان ملاحظہ فرمایا۔ ایسے خطوط اور عبارات میں نے حذف کر دی ہیں۔ اور اس مجموعہ میں ان کو شامل نہیں کیا ہے۔

میکدہ کے لفظ سے غالب کا شعر یاد آیا ؎

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔ "لیکن میں بصد احترام و ادب یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے جذبات و خیالات کے لئے اور کیا پیرایۂ بیاں اختیار کرنا چاہیئے، حقیقت کا اظہار آپ کو پسند نہیں، تاویل کی حقیقت آپ سے پوشیدہ نہیں رہتی تو کیا اب میرے لئے بجز صبر و شکر، کوئی چارۂ کار نہیں رہا۔"

میں نے اس فقرہ کو بار بار پڑھا اور لطف اٹھایا۔ جناب کے کسی فقرے کے جواب میں قلم اٹھانا میرے لئے تو بہت دشوار ہے، لیکن جواب سے سکوت اختیار کرنا بھی غالباً مناسب نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اظہار حقیقت سے تو ناگواری کی وجہ نہیں۔ لیکن گفتگو اس میں ہے کہ حقیقت ہے یا نہیں اگر ایسی حقیقت ہے جس کا مجکو علم نہیں تو میں معذور ہوں اور جب حقیقت ہی غائب ہے تو تاویل کس کی ہو۔

محمد اسعد اللہ

(۲۷)

۲ر۳ر۴ر مارچ ۱۹۴۹ء

میں اچھا ہوں، لیکن کیا اچھا ہوں، روح بیمار ہے، دل بیمار ہے، مولانا فرماتے ہیں ع "نیست بیماری چو بیماریٔ دل" مجھے تو یہی مصرع لکھنا مقصود تھا، اب پورا شعر لکھتا ہوں ؎

"عاشقی پیدا است از زاریٔ دل نیست بیماری چو بیماریٔ دل"

کل صائب کا ایک مصرعہ لکھا تھا، آج اس کا بھی دوسرا مصرع لکھتا ہوں ؎

ساقی بیک پیالہ کہ وقتِ سحر رساند
مارا ازیں جہاں بجہاں دگر رساند

میرے پاس عریضوں کی نقل نہیں رہتی ہے۔ اس لئے میں اس وقت صحیح طور پر گذشتہ سے آگے نہیں لکھ سکتا۔ خیر، میں نے حیدر آباد میں حضرت جلیل کو ان کے ارشاد پر اپنے کچھ شعر سنائے تھے۔ اس شعر کو انھوں نے بہت پسند فرمایا تھا ؎

کسی کو ظلم کا مجھکو کرم کا شکوہ ہے نگاہِ لطف سے پہلے مرا یہ حال نہ تھا

اسی طرح جناب نے اس نعتیہ شعر کو سراہا ہے ؎

وہ ذات ہے جنابِ رسالت مآب کی   ادراک کی حدود سے بالا کہیں جسے

میرے ایک دوست تھے مولوی غلام مصطفیٰ صاحب ذوقیؔ، جواں صالح، تہجد گزار شریف المزاج، نیک طبع، مجھ سے انھوں نے پڑھا بھی تھا۔ قدرت نے ان کو شاعر پیدا کیا تھا۔ کبھی کبھی میں ان کے اشعار کو سن کر کچھ کچھ مشورہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو غالباً ان کے لئے صفِ اول میں ہی جگہ ہوتی۔ اُن کا سب سے پہلا شعر مجکو یاد ہے ؎

وہ نظریں پھیرتے ہیں اور میری روح کھنچتی ہے   بلا کا ربط ہے تارِ نظر کو رشتۂ جاں سے

انھوں نے شاید تیسری غزل میں لکھا تھا ؎

جنوں میں قیس کے نقشِ قدم سے بچ کے چلتا ہوں
مری آزاد فطرت مانعِ تقلید ہوتی ہے

ان کا خیال تھا کہ عمرِ مستعار میری معیت ہی میں بسر کریں گے۔ لیکن ع

ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

حدیث شریف کے سالانہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی بخار میں مبتلا ہوئے، جس نے بہت جلد تپِ دق کی صورت اختیار کر لی اور ان کو شہادت کے مرتبہ سے مشرف کر دیا۔ ان ہی ذوقی صاحب نے میرا یہ شعر سنا ؎

آؤ بیٹھیں مرکزِ انوار کی باتیں کریں
نور برسائیں رُخِ دلدار کی باتیں کریں

مجکو یاد ہے کہ سن کر کھڑے ہو گئے اور شاید تھوڑی سی رقص کی شکل بھی پیدا

ہو گئی تھی۔ پس تمام عمر میں میرے یہ مذکورہ بالا تین شعر پسند کیے گئے۔
آج گلستان مسرت" دیکھ رہا تھا کہ یہ شعر نظر پڑا ؎

باغباں گل نہ گرفتم زمن آزردہ مشو
پارہائے جگر خویش بداماں کردم

چونکہ جناب نسیم جگر"[1] کی طباعت کا انتظام وانصرام فرمارہے ہیں، اس لئے فوراً اس جانب میرا ذہن منتقل ہوا کہ جناب مقدمہ" میں کسی موقع پر اس شعر کو تحریر فرمائیں گے، تو غالباً ناموزوں نہ ہوگا، اس شعر کا قائل معلوم نہیں "گلستان مسرت" میں لاعلم لکھا ہے۔

محمد اسعد اللہ

---

[1] اس کے متعلق زیر مکتوب ۱۲۲ نوٹ دیا جا چکا ہے۔ شروع شروع میں طباعت وغیرہ کا انتظام میرے سپرد تھا۔

(۲۸)

۶ تا ۹ مارچ ۱۹۴۹ء

اس وقت آسمان ابر آلود ہو رہا ہے اور خان آرزو کا یہ مصرع یاد دلا رہا ہے

ع میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

مرزا غالب نے اب سے ۹۵ سال پیشتر محمد حسین دکنی کی مشہور کتاب "برہان قاطع" پر کچھ اعتراضات کر کے "قاطع برہان" کے نام سے شائع کئے تھے اور اس کے آخر میں مختلف فوائد لکھے ہیں، خان آرزو کے اس مصرع کے متعلق جو فائدہ لکھا ہے اس کا خلاصہ اردو میں پیش کرتا ہوں۔

برسات کی ایک رات میں سراج علی خاں آرزو (غالباً سہو کاتب ہے صحیح نام سراج الدین علی خاں ہے) کے خیال میں ایک مصرع آیا، غالب کہتے ہیں۔ "نہ مصرع بلکہ نشترے، نہ نشترے بلکہ سنانِ آبدارے، چنانکہ نگارش ہمی پذیرد مصرع۔ میکشاں مژدہ کہ ابر آمد بسیار آمد۔ حقا کہ اگر گویند ایں زمزمہ از فغانی است یا از نظیری، کیست کہ باور نکند۔" خان آرزو نے پھر یہ پیش مصرع بہم پہنچایا۔

"تند وپُر شور وسیہ مست ز کہسار آمد" اور اُسی شب تاریک میں حضرت مرزا مظہر جانجاناں کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا شعر سُنایا۔ حضرت مرزا صاحب نے داد دی، تحسین کی دو تین دن کے بعد تمام شہر میں یہ مطلع مشہور ہو گیا۔ اتفاقاً خان آرزو کی کسی محفل میں ایک نو وارد شیرازی سوداگر سے ملاقات ہو گئی۔ خان آرزو نے مطلع سنایا، لیکن شیرازی نے پہلا مصرع سنتے ہی قہقہہ لگا کر کہا کہ میں سمجھ گیا، جناب مصرعۂ ثانی میں کیا فرمائیں گے۔ خان صاحب نے فرمایا: فرمایئے میں کیا عرض کروں گا۔" شیرازی نے کہا "خواہی گفت خرس (ریچھ) آمد"۔ خانصاحب نے زہر خند کے بعد اپنا مصرع پڑھا۔ شیرازی نے اس مصرع کی تعریف کے بعد کہا: "پیش مصرع پُر ناز بیاست اگر ایں چنیں بودے خوش بودے "قطرہ افشاں بہ سوِ شہر ز کہسار آمد"۔ غالب نے شیرازی کے مصرع کو ترجیح دی ہے۔

شارح دیوان غالب جناب نظم لکھنوی سے کسی صاحب نے فرمائش کی تھی کہ اس مصرع پر پیش مصرع لگا دیجیے۔

جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

نظم صاحب نے مندرجہ ذیل دو مصرع فرمائے۔

(۱) لطف جب ہے کہ برسنے لگے میخانے پر
(۲) کیا عجب ہے کہ صراحی بھی کرے سجدۂ شکر
جھومتی قبلہ سے گھنگور گھٹا آتی ہے

صفدر مرزا پوری کا یہ شعر پہلے نقل کر چکا ہوں ؎

نہ یہ اُودی گھٹائیں ہیں نہ ساقی تخت پریوں کے
ہوا کے دوش پر اُڑتا ہوا میخانہ آتا ہے

۵۔ باغباں گل نگر نسیم الخ کو جناب نے پسند فرمایا۔ مجھے مسرت ہوئی۔ "نسیم جگر" نام میں مجھ کو بھی تردد ہوتا تھا۔ لیکن "چھوٹا منھ بڑی بات" کہہ کر کچھ عرض نہیں کیا گیا۔

اب چونکہ جناب تشریف لا رہے ہیں، اس لئے اس پھیکے ترین عریضہ پر یہ طویل سلسلہ ختم کرتا ہوں اور بیجا سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں۔

حضرت جگر کی خدمت میں سلام۔

محمد اسعد اللہ

مکاتیبِ جگر

صحائفِ اسعد

مکتوباتِ عزیز

جامع

تسکین

ناشر:- ملک اینڈ کو پبلشرز

اُردو بازار دہلی